گیلی سڑک

عائشہ اسلم

Yasir Islam

گیلی سڑک

Personal Copy

گیلی سڑک

عائشہ اسلم

پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز
۲۵۔ لوئر مال لاہور

باذوق، منفرد لوگوں کے لئے خوبصورت
پیشکش اور معیاری کتابیں
کرنے والا ادارہ

پیش کار : طاہر اسلم گورا

جملہ حقوق محفوظ

بار : اوّل
تعداد : پانچ سو
تاریخ اشاعت : ۱۹۹۰ء
مطبع : طیب اقبال پرنٹرز
قیمت : ۴۰ روپے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

در طلب کوش و مدہ دامنِ امید زدست

دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے

(اقبالؔ)

تمہید

میں سچ کہتی اور لکھتی ہوں۔
میں نے برسوں یہی سچ خود پہ جھیلا ہے۔
میں سچ سے نہیں ڈرتی۔
ہاں —— منافقت سے مجھے خوف آتا ہے
اسی لئے میں سچ اور جھوٹ کے دوراہے پہ کھڑی ہوں۔
میں نیند میں رہتی ہوں۔
میں بھی خواب دیکھتی ہوں۔
خوبصورت اور حسین خواب
خواب ہی تو ہماری پناہ گاہ ہے۔
زندگی کی دھوپ میں خواب کا سایہ بہت سکھ دیتا ہے۔
خوابوں کا سفر، زندگی کا سفر ہے
خواہشوں کا سفر۔
امن کے پرندے کا سفر
جس کا چہرہ میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں
میرا بھی جی چاہتا ہے
کہ ہم پرندوں کی طرح سفر کرنا سیکھیں

ایک ہی آواز پہ سب منزل کو روانہ ہوں۔
ایک ساتھ پرواز
زمین کی پستی سے آسمان کی بلندی تک پرواز
لیکن پرواز میں کوتاہی نہیں آتی
کوئی پرندہ بھی دوسرے پرندے سے آگے نہیں نکلنا چاہتا
کسی کو کہنی نہیں مارتا۔
کسی کے پَر نہیں توڑتا
ان سب کا مقصد ایک ہے
جستجو ایک ہے۔ سفر ایک ہے
ہم سفر کئے بغیر منزل پہ پہنچنا چاہتے ہیں
کچھ پہنچ بھی جاتے ہیں
لیکن وہ منزل نہیں ہوتی ——
جیسے راستے میں کسی غلط اسٹیشن پر اُتر جانے سے ہم اصل مقام پر نہیں پہنچ جاتے۔
آخر بھٹکنا ہی ہمارا مقدّر کیوں ؟
قسمت کی یہ لکیر تو ہم خود اپنے ہاتھوں میں کھینچتے ہیں۔
لکیر ہاتھ پہ نہ بھی دکھائی دے تو زندگی میں ضرور نظر آتی ہے۔
ایسے میں سفر پہ روانہ ہونا اور سفر میں رہنا بہت دُکھ دیتا ہے۔
منزل تک پہنچنا مشکل بھی ہے۔
بعض صورتوں میں ناممکن بھی ——
میں مشکل کو سہل بنانا جانتی ہوں۔
کبھی کبھی ناممکن کو ممکن بھی بنا دیا کرتی ہوں۔
میرے لئے ہر شکست کے پیچھے کوئی نہ کوئی جیت چھپی ہوتی ہے
شکست تو اپنے ہونے کا ایک ثبوت ہے۔
میں بھی اپنے ہونے کے ثبوت جمع کرتی پھرتی ہوں۔
لوگوں نے نکتیں اور سکّے جمع کئے۔
میں نے اَن گنت تجربے جمع کئے۔
یہ سفر اور گیلی سڑک

ایک دو برسوں کی آنکھوں دیکھی کہانی نہیں
بلکہ ساری عمر کا منظر نامہ ہے
میں نے سفر اور گیلی سڑک کو ریت گھڑی میں قید کر لیا ہے
جس طرح میں نے اپنے پاؤں کے نشان گیلی سڑکوں پہ قید کر لئے۔
میں آج بھی ان گیلی اور ویران سڑکوں پہ پتوں کی طرح چلتی پھرتی رہتی ہوں
کیونکہ میں پوشیدہ اور پُراسرار راز جاننا چاہتی ہوں۔ میں ہر لمحہ سفر میں رہتی ہوں
سب سے پہلے میں نے خود کو جانا
پھر اس پراسرار دُنیا کو دیکھا
زندگی میں پراسراریت نہ ہو تو زندگی کیسی ؟
زندگی ایک خوبصورت لفظ ہے —— ہے نا۔؟
حقیقت کا چہرہ کتنا بدنما کسقدر بدصورت ہے —— ہے نا —— ؟
یہ ویسی زندگی ہرگز نہیں جیسی میں نے کتابوں میں پڑھی، خود سوچی یا چاہی تھی
گھر کی چار دیواری میں رہنے والی عورت کے لئے زندگی واقعی خوبصورت ہے۔
میرے لئے بھی تب زندگی میں زندگی کے لفظ کا احساس تھا۔ تب وہ زندہ زندگی تھی۔
جب گھر کی دہلیز سے باہر پہلا قدم رکھا تھا تب تمام منظر تبدیل ہو چکا تھا۔
یہ اندھی آنکھوں کا پہلا ادھورا خواب تھا۔
ہم ادھورے خواب اور ادھورے سچ میں ہی جیتے اور مرتے ہیں
ہماری نسل کو ورثے میں کچھ بھی ثابت نہ مل سکا۔
ہم بھی نامکمل ہی رہیں گے
تکمیل کی آرزو مجھے بھی تھی اور ہے
ایک بازگشت سُنتی ہوں۔
میرا دیکھنا، سوچنا اور چاہنا غلط نہیں ہو سکتا
مَیں نے خود سے یہ بات اس وقت کہی تھی۔ جب میں ناداں تھی
میں جو آج باشعور ہوں اپنے کل پہ حیران ہوتی ہوں
کل کی حیرت دُکھی ہے، افسردہ ہے
کل میں ہنسنا جانتی تھی۔
آج میں رونا بھی بھول گئی ہوں

خشک آنکھوں سے گذرتے دنوں، ٹھہرتی راتوں کو دیکھا کرتی ہوں
کتنا تضاد ہے ؟
یہاں موسم سے زیادہ لوگ سرد ہیں
اور سورج کی تپش سے کہیں زیادہ شدّت اور گرمائش
ہم انسانوں کے لہو میں ہے
پتہ نہیں ہم کیسے زندہ ہیں ؟
سوال ہمارے اردگرد دھمال ڈالتے ہیں
لیکن کوئی تھاپ ہمارے دل پہ نہیں پڑتی
ہم بے حسی کی چادر میں اپنا آپ چھپا کے خوش ہیں
میں بھی بہت خوش تھی
جب میں نے اس کانٹوں بھرے راستے پہ پہلا قدم رکھا تھا
کیونکہ میں علم نہیں رکھتی تھی
کل میں نہیں جانتی تھی کہ سفر میں کیسے کیسے مقام آتے ہیں
کیسے دشوار مرحلے آتے ہیں ؟
سفر کی ابتدا میں اکثر اندازے غلط ہو جایا کرتے ہیں
ہم موسم اور حالات سے باخبر نہیں ہوتے
زمانے کی بے رحمی کا نہیں سوچتے
نہیں جانتے کہ کب انہونی، ہونی بن جائے۔
اور کب ہونی، ہونے سے رہ جائے
پھر وقت کی آنکھیں دیکھتی ہیں
کہ ہم تجربوں کی بارش میں بھیگتے چلے جاتے ہیں
تب اُس پہلے لمحے کو یاد کرنا کتنا بھلا لگتا ہے
جب پہلا حرف، آگہی کا پہلا دروا ہوا تھا
کون جانتا تھا
کہ ہم اپنے جنوں کے ہاتھوں رسوا ہوں گے
اتنے لمبے اور تھکا دینے والے سفر پہ روانہ ہوں گے
جہاں تنہائی ہمارے تلوے چاٹے گی

اُداسی ہوا بن کر ہمارے بکھرے بالوں میں کنگھی کرے گی
تب ہر جادو بے اثر ہو جائے گا۔ لفظ جانے کیسا جادو کرتے ہیں؟
پھر تخلیق کا کرب ہمارے ہاتھوں ذہنوں اور جسموں سے
کاغذوں پر منتقل ہو جائے گا۔
ہم جانتے ہیں کہ گونگی تاریخ کے کٹہرے میں حرف ہی گواہی دیں گے
روح کے آبلے درد کی شدت میں گویائی کی قوت سے محروم ہو جائیں گے
ہم وقت کے آگے دست بدُعا ہوں گے
ہمیں وقت اور زمان و مکاں کی قید سے رہائی مل جائے گی
ایک ایک کر کے استنے سنگِ میل گذر جاتے ہیں
ہمیں فاصلہ ناپنے اور شہر دیکھنے کی عادت نہیں رہتی
ہم ہندسوں اور حرفوں کا فرق بھی بھول جاتے ہیں
ہر شناخت کھو جاتی ہے
حرف اور ہندسوں کے ساتھ ساتھ ہم خود بھی کہیں کھو جاتے ہیں
شائد ہم آگے اور آگے بہت آگے نکل جاتے ہیں
جہاں سے کوئی کبھی واپس نہیں آتا ہے ——— !

مارچ ۸۷ء

عائشہ اسلم
۲۲ غالب کالونی۔ سمن آباد لاہور

سفر

فہرست

۱۔ پہلی بات ---------- ۱۹

۲۔ خاموشی ---------- ۲۷

۳۔ بازگشت ---------- ۳۵

۴۔ دُعا ---------- ۴۱

۵۔ سوال ---------- ۴۹

۶۔ سفر ---------- ۵۳

۷۔ فاصلہ ---------- ۵۷

۸۔ صدا ---------- ۶۱

فہرست

گیلی سڑک

۱۔ دوراہا ---------- ۶۷

۲۔ آگہی ---------- ۷۳

۳۔ برزخ ---------- ۸۱

۴۔ تلاش ---------- ۸۹

۵۔ رقصِ مجذوب ---------- ۹۵

۶۔ نیا جنم ---------- ۱۰۳

۷۔ بے انت سفر ---------- ۱۰۹

۸۔ گیلی سڑک ---------- ۱۱۷

۹۔ آخری سانس ---------- ۱۲۳

سفر

پہلی بات

سفر

میں ایک ایسے کردار کی داستان رقم کر رہی ہوں۔ جس کی زندگی کی ہر بات شام سے شروع ہو کر شام ہی پر ختم ہو جاتی۔

اس کا اپنا آپ بھی اسی شام کے دھندلکوں میں کہیں کھو جاتا ہے اور یہی شام کی پرچھائیں اُس سے اُس کی شناخت بھی کرواتی ہے۔ اُس سے اُس کا اپنا آپ ملواتی ہے۔ وہی شام جو اُس کے ہر سکھ دکھ کو خاموشی سے اپنے آنچل میں چھپا لیتی ہے۔ وہی شام جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی جُدا ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ ایسے معاشرے میں جنم لینے والی لڑکی جہاں عورت کو مجبوراً مصلحتاً یا پھر ضرورتاً گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تو دی جاتی ہے۔ مگر ایک زنجیر سی اس طرح اُس کے پیروں میں ڈال دی جاتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہش سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتی۔ آزاد ہونے کی بجائے وہ پہلے سے کہیں زیادہ پابند ہو کر رہ جاتی ہے اور یوں وہ اپنی مرضی سے اپنے ہی جیون کا ایک سانس بھی نہیں لے سکتی۔ میں بھی وہی ایک لڑکی ہوں جو اپنی زندگی کے اس ایک سانس کے لیے برسوں سے ترس رہی ہے۔ مگر اُس عورت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو اپنے آپ کے لیے ترس رہی ہو۔ جانے کب سے؟

جانے کب سے میں ڈھلتے سائیوں کی اسیر ہوں مگر ایسی جو رہائی نہ چاہتی ہو۔ اس کجلائی ہوئی شام نے کبھی تو بہت اپنائیت اور پیار سے مجھے اپنے گلے لگا لیا اور کبھی کسی اجنبی کی طرح منہ موڑ کے میری زندگی کی راہوں سے بنا چاپ کئے گزر گئی۔ یہ شام کبھی تو ملاپ کی گھڑی بن جاتی ہے۔ اور کبھی جدائی اور چھوڑے کا وہ ٹھہرا ہوا لمحہ جب ریل کی سیٹی میں ہجر کا دُکھ شامل ہو جاتا ہے۔ تب کسی اپنے کو الوداع کہنے کے لیے نہ تو ہاتھ اُٹھتے ہیں۔ اور نہ ہی بچھڑنے والے کا دھواں دھواں چہرہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ آنکھیں جن میں اُداسی اور غم کے شبنمی قطرے چھپے ہوں وہ اپنے وجود کے کسی حصے کو خود سے دُور جاتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی ہیں۔ جبر اور صبر کے یہ کٹھن مرحلے ہر شخص پہ آتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے۔ کہ ان کی آواز اور تاثر بدل جاتا ہے۔ ہنسنے والے لوگوں کے چہرے بدل جاتے ہیں۔ ان کے نام بدل جاتے ہیں۔ مگر یہ کسی بھی دھرتی کے ان دیکھے، انجانے بیج ہی کیوں نہ ہوں کبھی نہ کبھی فصل ضرور دیتے ہیں۔ ان خوبصورت گیتوں کو لفظ دینے والے جذبے گہرے اور سچے ہوتے ہیں۔ ان کے سُروں کی طرح جن کے سچے اور سُچے ہونے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی بس آدمی کے اندر دھڑکتی دھڑکنوں اور دل کی گواہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے اس ضروری گواہی کے بارے میں بھی کیا کہنا کہ یہ تو کسی کسی شخص کی نظر میں اہم اور معتبر ہوا کرتی ہے۔ عام لوگ تو اس آواز کو نہ واضح طور پہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی سُن سکتے ہیں۔ یہ دُکھ کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔ کسی کسی کی زندگی کا المیہ ہوتے ہیں۔

جذبوں سے پیار کرنا، دوستی کرنا، ان سے اپنے دل کی باتیں کرنا مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا رہا ہے۔ نفرت، حسد، محبت، تنہائی، اُداسی ہر کیفیت ہر رنگ سے میں نے قریباً ایک سی تصویریں بنائی ہیں مگر محبت کا رنگ زیادہ گہرا ہوتا ہے اس رنگ سے تصویریں جتنی خوبصورتی سے بنتی ہیں اتنی ہی بدصورتی سے بگڑتی بھی ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں بھی ایک بگڑی تصویر ہوں۔ یا تو ٹھیک سے بن نہیں پائی یا پھر بنتے بنتے رہ گئی۔ مجھ میں کئی رنگ تو ابھی تک آئے ہی نہیں اور کئی شاید مصور نے غلط لگا دیئے۔ ممکن ہے اُس کے ہاتھ میں وہی رنگ آئے ہوں یا وقتی طور پہ اس کی نظروں کو وہی رنگ بھائے ہوں کہ اُس نے میری تصویر کو ان رنگوں کے سپرد کر دیا اور خود دور کھڑا مجھ پہ ان رنگوں کا اثر دیکھتا رہا ہو کہ کونسے رنگ میں رنگ کے میں اپنا حُسن لازوال بنا لیتی ہوں اور کونسے رنگ کی وجہ سے میری خوبصورتی بدصورتی میں بدل جاتی ہے۔ آشا تو نا رہی رنگ کے حُسن لازوال کی صورت میں ڈھل گئی تھی مگر میں تو آشا نہ کل بن سکتی تھی نہ آج —— کیونکہ میں آشا نہیں مینا ہوں۔ آشا نہیں مینا جس کی آواز خوبصورت ہوتی ہے، رنگ روپ نہیں۔ میرا حُسن تو بہت کم لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ سب

لوگ میری طرف متوجہ نہیں ہوتے ۔ ایسا نہیں کہ میں بے رنگ ہوں ۔ میرے تو ہزار رنگ ہیں جنہیں میں نے ہمیشہ دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا اور بارہا اپنے رنگ اپنے آپ سے بھی چھپائے ہی میں نے برسوں اپنے رنگوں کو اپنی ذات میں سمیٹے رکھا مگر کبھی کبھی ان رنگوں کی کوئی چھینٹ کوئی لکیر یا اظہار کا کوئی نقطہ پھیل کر اگر لفظ یا جملہ بن جاتا تو دیکھنے والے ششدر و حیران رہ جاتے ۔ کیونکہ اس تصویر کو انہوں نے خاموشی ہی دیکھا تھا اور جانا تھا کہ یہ تصویر کچھ دیکھ نہیں سکتی کچھ کہہ نہیں سکتی ۔ اگر یہ دیکھنے یا کہنے لگے تو سُننے والوں کی حیرت بے انتہا بھی ہوتی ہے اور یقینی بھی ۔ جبکہ ہر نقطے ہر لکیر ہر عکس پہ اُن کے پہرے تھے ۔ حتیٰ کہ صدا بھی دوسرے شخص تک نہیں پہنچ سکتی تھی پھر یہ کیوں اور کیسے ہوا ؟ خلافِ توقع تو زندگی کے ہر موڑ پہ بہت کچھ ہوا کرتا ہے مگر ہمارے یہاں عورت اگر جائز حقوق کی بات کرتی ہے ۔ جدوجہد کرتی ہے تو باغی کہلاتی ہے ۔ جن چیزوں سے اُسے محروم رکھا جاتا ہے وہ تمام چیزیں حاصل کرنا اُس کا حق ہے ، مگر حق تسلیم کیا نہیں جاتا بلکہ کروایا جاتا ہے ۔ بھوکے کو اپنی بھوک کے بارے میں بتانا پڑتا ہے ۔ پیاسا جب تک کنویں سے اپنی پیاس کی بات نہیں کرے گا تب تک اُس کی پیاس نہیں بجھے گی ۔ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خلوصِ نیت سے محنت کرنا پڑتی ہے ۔ رزق تلاش کرنا پڑتا ہے ۔ وہ بہت کم خوش نصیب ہوتے ہیں ۔ جنہیں محنت اور کوشش کے بغیر سب کچھ مل جاتا ہے ۔ کبھی کبھی منزل کی تلاش میں کٹھن راستوں پر چلنے والے تھک کر کچھ پل کے لیے ٹھہر جاتے ہیں ۔ اور کبھی تھکنے سے پہلے ہی نشانِ منزل آپ کے قدم چومتا ہے ۔ پھر کیسے کوئی اپنے حق کے لیے کوشش نہ کرے ۔ ہم سبھی لوگ عمر بھر لفظوں کے غلط معنی و مفہوم کے استعمال کی عادت انجانے میں ڈال بیٹھتے ہیں ۔ جبھی بغاوت جیسے لفظ بھی عادت میں شامل ہو جاتے ہیں ۔

ہم مظلوم سے یہ حق کیوں چھیننا چاہتے ہیں ۔ کہ وہ خود کو مظلوم نہ کہے ۔ مجھے منافقت اور بغاوت کے ہر لہجے سے نفرت رہی ہے اس کے باوجود اگر میں معاشرے کے مروجہ رسم و رواج اور اصولوں سے خود کو الگ محسوس کرتی ہوں ۔ غلط باتوں پر احتجاج کرتی ہوں تو مجھ پر باغی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ اس الزام کی بنیاد میں اپنے گھر کی پہلی اینٹ شامل ہوتی ہے پھر ایک ایک اینٹ بڑھتے بڑھتے ایک گھر ایک شہر کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ باہر سے اینٹیں لانے والے بھی اس سازش میں شریک ہوتے ہیں ۔ اور یوں سب چہروں سے نقاب اُن کے چاہے بغیر ایک ایک کر کے سرکاتے چلے جاتے ہم اصل چہروں تک پہنچ جائیں گے ۔ مجھے علم ہے کہ میری کس بات سے کس چہرے پر غم و غصہ کی لہر آئے گی ۔ کون مسکرانے ہمت کر سکے گا ؟ میرے کس جملے کی گرفت کس شخص پر زیادہ ہو گی کس پر کم ؟ کیونکہ میں برسوں

سے ان لفظوں کا کھیل کھیلتی چلی آ رہی ہوں ۔ گو اس کھیل میں میں تنہا رہ گئی ہوں ۔ مانتی ہوں کہ سب میں رہتے ہوئے سب سے کٹ کر رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے مگر میں اس جیسی کئی اور مشکلوں کو جھیلنے کی عادی ہو چکی ہوں ۔ مجھے ان عادتوں کو عادتیں بنانے میں اتنا ہی وقت لگا جتنا کسی کمہار کو کوری مٹی سے برتن بنانے میں لگتا ہے ۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ وقت لگا ہو ۔ مجھے اپنی مرضی کا بنانے کے لیے کئی کمہاروں نے کوشش کی مگر چونکہ میرے ذروں میں ہٹ دھرمی ، خود سری ، اذیت پسندی اور ڈھٹائی کے لیے کنکر بھی شامل تھے ۔ اس لیے بنانے کی کوشش میں یہ برتن بگڑتا چلا گیا ۔ جب اس کی کوئی شکل نہ رہی تب میں نے اپنی سوچ اور شعور کی مٹی سے اپنا آپ بنایا ۔ یہ میرا اپنا آپ کیسا بنا ؟

اسے کس کس نے پسند یا ناپسند کیا اس بات کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی میں صرف اپنے کہے ماننے اور چاہنے کی پرواہ کرتی ہوں ۔ کیسی ہوں ؟ اسکا فیصلہ آپ ابھی مت کیجئے ۔ تھوڑا سا انتظار کر کے دیکھیے شاید اس فیصلے کو تبدیل کرنا پڑے ۔ میری شخصیت کی کچھ خوبیاں اور خامیاں جان لیجئے ۔ تب میرے متعلق کچھ کہنے کا حق آپ زیادہ رکھتے ہوں گے ۔ جب میری شخصیت کے تضادات ، سچ اور جھوٹ آپ پر کھل جائیں گے ۔ میں وینس کے مجسمے کی طرح برہنہ ہو جاؤں گی مگر ادھورا جسم اپاہج بانہیں کسی کے کیا کام آ سکتی ہیں ؟ یہ بیان بھی آپ کو بدلنا ہوگا کیونکہ جسم کی خوبصورتی جلد فنا ہو جاتی ہے ۔ مگر روح کا حسن کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ ہمیشہ روح کی ضرورت رہتی ہے ۔ روح کا دل اور دماغ ہی انسان کو اپنا اسیر کرتا ہے ۔ جبکہ مٹی سے بنا ہوا انسان مٹی میں مل جاتا ہے ۔ "مٹی" مجھے تو عورت کا ذہن بھی مٹی کی اس ہنڈیا جیسا لگتا ہے جس میں کبھی تو لذیذ کھانوں کی مہک پاگل کر دیتی ہے اور کبھی اس میں چیزیں جل بھی جاتی ہیں ۔ جس میں جلانے والے کا قصور کم اور آگ کا زیادہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ آگ کا بھڑکنا اور شعلوں کا لپکنا فطری عمل ہے ۔ آپ کو پتہ ہے کہ میری اس ہنڈیا میں گزرے دنوں کی ساری جلن کھرچنے کے باوجود رہ گئی ہے اور اس کا ذائقہ تمام اچھے لمحوں کے امرت کو زہر بنا دیتا ہے ۔ اس امرت کے زہر بننے ہی کی وجہ سے مجھے اپنے سارے خوابوں ، خدشوں ، دکھوں اور آنسوؤں سے اتنا ہی پیار ہے ۔ جتنا کسی بھی عورت کو اپنے گہنوں سے ، ہار سنگار سے ہوتا ہے ، یہ تمام گزرے پل بھی یادوں کے پہناوے ہیں ۔ جنہیں ہم مختلف وقتوں میں استعمال کرتے ہیں ۔ کبھی اپنے لیے کبھی دوسروں کے لیے سنگار کرنا ہی پڑتا ہے ۔ مجھے ہمیشہ نوادرات سے دلچسپی رہی ہے اُن کی کھوج رہی ہے ۔ مجھے تمام چیزوں پر پسندیدگی کی مہر لگانے کی عادت نہیں ہے ۔ بہت کم چیزوں کی جانب میں پلٹ کے دوبارہ دیکھتی ہوں ۔ دیکھنے کو تو میں حیرت سے بار بار اس دُنیا میں رہنے والوں کو بھی دیکھتی ہوں ۔ کہ اتنے چھوٹے دل

اور دماغ کے لوگ یہاں کیوں ہیں ؟ میں بہت کوشش کے باوجود دُنیا والوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اُن کے بھید بھاؤ میری عقل و فہم سے آگے بہت آگے کی باتیں ہیں۔ میں اتنا آگے بھی نہیں جانا چاہتی کہ پھر تنہا رہ جاؤں۔ آنے والوں کی آس میں کب تک اپنا چین اور اپنے نین گنواتی رہوں گی۔ میں تو بہت پہلے اپنا آپ گنوا بیٹھی ہوں۔ جب سے میں نے تنہائی کو دیکھا ہے۔ دُکھ کے راز کو جانا ہے۔ تب سے مجھے اپنی تھکن اپنا طویل سفر (جو شاید بے انت سفر ہو) زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔ اگر یہ سُکھ نہیں دیتا تو بہت دُکھ بھی نہیں دیتا۔ پھر جب دُکھ سے عُمر بھر کا ناتا ہو تب یہی دُکھ انسان کو زندہ رکھتا ہے اُسے جینے پر اُکسائے رکھتا ہے۔ میری آنکھیں یہ سوچ سوچ کر اُداسی سے بھرنے لگتی ہیں۔ کہ میری اور اس دھرتی پر بسنے والوں کی باتیں اور سوچیں کچھ بھی تو نہیں ملتا۔ مجھے ہر قدم پہ حاصل ہونے والے مالی فائدوں اور منافقتوں سے کذب و ریاکاری کی دُھول میں اٹے چہروں سے نفرت ہے۔ یہ نفرت ہمیشہ میری اُنگلی میں چھلّہ بن کر رہی ہے۔ میں نے زندگی بھر کچھ چیزوں کچھ موقعوں پر اپنی راہوں سے ہٹ کر چلنا نہیں سیکھا۔ چاہے یہ راہیں مجھے خاموشی کے ڈیرے پر ہی کیوں نہ لے جائیں۔ آنسوؤں کے گہرے کنویں میں ہی کیوں نہ دھکیل دیں۔ مگر میں یہاں پر مجبور ہو کے رہ جاتی ہوں۔ کئی اور مقامات بھی میری راہیں روک لیتے ہیں اور پھر اپنی راہوں میں چاک سے کھینچی سفید لکیریں بھی تو میرے ہی ہاتھوں سے لگتی ہیں۔ بس یہاں سے آگے مجھے نہیں جانا۔ میں نہیں جانا چاہتی۔ کیونکہ آگے اُن کی دنیا ہے جو مجھ جیسے نہیں۔ ان سے مجھے کیا لینا؟ اُن کی دنیا میں میرا کیا کام ہے؟

میں تو ہمیشہ اپنے ارادوں اور اپنے فیصلوں سے زندہ رہی ہوں۔ پھر ان کے ارادوں اور فیصلوں کو زندگی کیوں دوں؟ میں نے تو انہیں صرف جدائی کی سزا دی ہے۔ (خود سے جدائی کی سزا) جو اپنی سیاہی سے میری تصویر بنانا چاہتے ہیں۔ اپنی خواہش کے مطابق مجھ میں رنگ بھرنا چاہتے ہیں میری زندگی کو اپنا عنوان دینا چاہتے ہیں کیونکہ میں ان کے منحوس چہروں اور سیاہ کاریوں کو جانتی ہوں۔ ان کے بگڑے ماضی اور گندے حال کو دیکھ چکی ہوں۔ جان چکی ہوں۔ ان جھوٹے چہروں میں رہتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا۔ مگر ان جھوٹے چہروں میں سچے چہرے بھی ہوتے ہیں۔ جن کی ایک جھلک کئی لمحوں تک نفرتوں اور منافقتوں کے خلاف کوشش کرنے اور کامیاب ہونے میں مدد دیتی ہے۔ ایسی مدد جو بنا بتائے اور بنا جتائے کی جائے۔ خلوص اور محبت سے احسانات کئے جاتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ کسی اور کو خبر نہ ہونے پائے۔ اپنے آپ کو بھی نہیں۔

جس طرح علی نے مجھ سے اور اپنے آپ سے چھپا کر اپنے اور میرے بیچ ایسا رشتہ قائم کر دیا۔ جسے کوئی نام

دینا مشکل ہے۔ ایسا بندھن جسے صرف جانا جا سکتا ہے۔ پتہ نہیں یہ اُس کی کوشش تھی یا بنا کوشش کے ہی اُس نے میری زندگی کے راستوں کو کاٹ کر ایک نیا راستہ بنا لیا اور میں آندھی آنکھوں سے اُسکا ساتھ دینے پہ مجبور ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں ہی اندھے تھے ایک دوسرے کی تلاش میں جانے کب سے بھٹک رہے تھے ممکن ہے ابھی اور ایک مدت گزر جاتی یونہی بھٹکتے بھٹکتے مگر وقت کی رحمدلی نے ہمیں ملا دیا۔ تلاش کا سفر ختم ہوا۔ ملن کا وہ پہلا لمحہ کیسا تھا؟ یوں سمجھو کہ اس کے لیے سارے لفظ ساری گواہیاں جھوٹی ہو گئی تھیں، وحدت کے سفر کی پہلی اُڑان زندگی کا خوشگوار اور ناقابلِ فراموش تجربہ ہوا کرتی ہے۔ چڑیا کے بچے کی پہلی خواہش جیسی جب وہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ پہلی نظر، پہلی کامیابی، عورت کے پہلے اور آخری پیار کی کہانی کی عورت کتنی ہی بہادر اور نڈر کیوں نہ ہو، فراخ دل بھی ہو مگر محبت کے معاملے میں وہ کبھی ہارنا نہیں چاہتی۔ وہ جانتی ہے کہ یہ ناکامی اس کے جیون کی تمام کامیابیوں پر بھاری ہو گی وہ گھاٹے کا سودا کرنا نہیں چاہتی۔ گھاٹے کا سودا تو کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا مگر ہو جاتا ہے۔ وقت کے کہنے میں آکر عورت صرف عورت بن کر نہیں سوچتی۔ وہ اپنے جذبوں کی زندگی چاہتی ہے موت نہیں۔ ان جذبوں کی زندگی، سپنوں کی زندگی کے لیے اُس کی ہر سانس کے ساتھ لاکھوں دعائیں بندھی ہوتی ہیں۔ اس کا تن من پکار کا موسم بن جاتا ہے۔ یہ رُت کبھی نہیں بدلتی۔ اسی رُت میں بھیگتے بھیگتے وہ زندگی کی آخری حدود کو چھو کر موت کی حویلی میں پاؤں رکھ دیتی ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ امیدیں اور خواہشیں بھی حویلی میں داخل ہو جاتی ہیں مگر اس کہانی کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا، کبھی نہیں!

ملّی میری نہ ختم ہونے والی اُمید بھی ہے اور ناامیدی۔ راستے کا ہر سنگِ میل بھی وہی ہے اور راستہ روک کر کھڑا ہونے والا پتھر بھی وہی — میں وہ مسافر ہوں جس کی منزل بھی سامنے ہو، نظر آ رہی ہو اور اس کے پاؤں بھی وقت کی دلدل میں دھنسے ہوں۔ یہ وقت جو کبھی حالات کا روپ دھار لیتا ہے اور کبھی دُنیا کا — کبھی دُنیا والوں کا اور کبھی چار دیواری کا۔ چوکھٹ اور دروازوں کا۔ دریچوں کا روشندانوں کا۔ مگر ایسے جن کی چٹخنیاں زنگ آلود ہو چکی ہوں۔ جالے جن کی حفاظت کرتے ہوں اور ہوا جن سے ڈرتی ہو۔ ڈرتی تو میں ملّی سے بھی ہوں۔ اُس سے ناراض بھی ہو جاتی ہوں اور غصہ بھی کرتی ہوں کیونکہ کبھی تو وہ بھی وقت کی دلدل کا حصہ بن جاتا ہے۔ تب میں اُس کے وجود سے محبت نہیں کر سکتی۔ اُس کو اپنا نہیں سکتی۔ مگر اس دنیا کو اپنانا بھی تو میں نے ملّی سے سیکھا ہے۔ اس نے مجھے اس بے درد اور ظالم دُنیا سے وفا کرنے کے ڈھنگ سکھائے ہیں۔ اس کے اور میرے بیچ بہت سی فصیلیں اور فاصلے حائل ہیں۔ زندگی کے بہت سے بوجھ آپ ہی چاہے بغیر اُس کے کاندھوں پر آ پڑے ہیں۔ یا پھر ڈال دیئے گئے ہیں۔

اُن کو کم کرنے کی صورت جب تک پیدا نہ ہوگی تب تک وہ مجھے مکمل طور پہ دنیاوی اعتبار سے اپنا نہیں سکے گا۔ ہم دونوں کی بڑی مجبوری اور معذوری اہم مسئلہ یہی ہے مگر اس سے یہ مت سمجھنا کہ کوئی اور مجبوری کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔ مجبوریوں اور مسائل کی ایک طویل فہرست ہر وقت ہمارے ساتھ رہتی ہے جسمیں ہر پل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں ہمارے ہاں اسقدر اضافے کیوں ہوتے ہیں؟ مگر کمی بھی اتنی ہی رہتی ہے۔ اتنے گھاٹے سنبھال کر یہ دُنیا کس طرح اپنے پیروں پہ کھڑی ہے میں آج تک نہیں جان سکی۔ بس خوفزدہ رہتی ہوں کہ کب ڈھے جائے؟ اور اگر ڈھے گئی تو کیا ہوگا؟ سوال تو یہ ہے کہ کیا نہیں ہوگا۔ اگر پہلے کچھ نہ بھی ہوگا تو آخر کب تک؟ کبھی تو کچھ ہوگا اور جو ہوگا —— اُسے کون بھگتے گا؟ بھگتنے کو تو ہم اب بھی زندگی کی سزا بھگت رہے ہیں مگر آپ یہ بھی مانیں گے کہ سزا عُمر قید کی ہے۔ اور بنا جُرم کی ہے۔ اب جو جُرم ہم نے نہیں کیا۔ اُس کی سزا ہم کیوں بھگتیں۔ صرف اس لیے کہ ہم سے پہلے بھی یہ سزا بھگتنے آئے ہیں۔ اور ہمارے بعد کے بھی بھگتیں گے۔ مگر کب تک؟

شائد یہ سوال صرف سوال بننے کے لیے زندہ ہے۔ اس کو جواب کی موت نہیں دی جاسکتی کہ پھر یہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ جواب نہ ملنے تک یہ سوال بار بار حملہ آور ہوتا رہے۔ بہت سے سوال اُن نادان بچوں کی طرح ہوتے ہیں جو پاؤں پکڑ لیتے ہیں۔ اور اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک جواب کا بہلاوا نہ ملے۔ مگر ایسے ہی کئی سوال ہم صدیوں تک خود سے کرتے رہیں گے اُن کے جواب ہم سے پہلے بھی کئی لوگ کہیں رکھ کے بھول گئے ہوں گے جو ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل سکے۔ ہمیں وہ کبھی نہیں ملیں گے اور غالباً ہمارے بعد والے بھی یونہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کھو جائیں گے۔ اور یہ سب صرف اس لئے ہوگا کہ ہم ملزم ہیں۔ مگر جُرم ثابت نہیں ہو سکتا جب تک ثبوت نہیں مل جائے اور ثبوت کبھی نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ خاموشی میں ہونے والے قتل اور موت کی خبریں اکثر شہ سُرخی نہیں بنا کرتیں۔ کچھ موتیں کچھ قتل گمنام بھی رہ جاتے ہیں۔ بس خاموشی اُن کی گواہ ہوتی ہے اور خاموشی اتنی گھنی اتنی چالاک ہے کہ کبھی کچھ نہیں بولتی بس چُپ رہتی ہے ایک طویل اور گہری چُپ جسے کوئی نہیں توڑ سکا۔ جانے کس دن یہ چُپ ٹوٹے گی۔ ٹوٹے گی بھی کہ نہیں؟ کوئی نہیں جانتا اور اگر جانتا ہے تو پھر بتاتا کیوں نہیں؟ کس سے خوفزدہ ہے اور کیوں؟

اُف! خدایا! جانے کب ان سوالوں کے چُنگل سے ہم انسان آزاد ہوں گے۔ کب؟ ہونگے بھی یا نہیں؟ ہمیں بہت سی باتوں کے بارے میں کوئی علم کیوں نہیں ہے۔ ہم کیوں یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں! پتہ نہیں۔ ہمیں کیوں پتہ نہیں ہے؟ ہمیں پتہ ہونا چاہیے مگر کیسے؟ افسوس

کہ یہ بھی ہمیں پتہ نہیں ۔ ہمیں تو اپنا بھی پتہ نہیں ۔ اپنوں اور غیروں کا بھی پتہ نہیں ۔ اس پتہ نہیں کا بھی پتہ نہیں ۔ ہم اتنے مجبور اتنے معذور کیوں ہیں ؟

پتہ نہیں ۔ پتہ نہیں ۔ کچھ پتہ نہیں !

خاموشی

لوئے لوئے بھرے کڑیئے جے توں رہ بھانڈا بھرنا
شام پئی بن شام محمد تے گھر جاندی نے ڈرنا

میاں محمد بخش کی یہ بات بہت سچی، گہری اور پراسرار سی لگتی ہے کیونکہ ہر روز میں خود اسی کیفیت سے گزرتی ہوں اور اپنی جان پہ جھیلتی ہوں۔ جب شام کی آخری کرنیں دستک دے چکی ہوں عموماً تب ہی میں اس دروازے کو کھٹکھٹاتی ہوں جسے لوگ میرا گھر مانتے ہیں جبکہ اس پہ میرے نام کی کوئی تکیر کوئی لفظ کوئی تحریر نہیں ہے۔ میں وہاں رہتی ہوں شاید اسی لیے لوگ اسے میرا گھر کہتے ہیں۔

جہاں دروازہ کھل تو جاتا ہے مگر اس کے بعد ہزاروں جملے بنا سوچے سمجھے میری جانب بڑھتے چلے آتے ہیں جنہیں روکنے کی مجھ میں ہمت نہیں اور شاید چاہت بھی ان راستوں سے لوٹ جایا کرتی ہے مجھے کھردرے اور حقیر لفظوں، اونچی آوازوں، غیر مانوس لہجوں اور اجنبی چہروں سے شدید نفرت رہی ہے بلکہ ایسی باتوں نے مجھ سے زبردستی نفرت کروائی ہے نفرتوں کو پالنا اور ان سے محبت کرنا ایک مشکل اور تکلیف دہ عمل ہے بلکہ ان سے نباہ کرنے کی کوشش بھی بہت کامیاب ثابت نہیں ہوتی اور یہ کام بھی سہل نہیں مگر مجھے اب نفرتوں کی کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ جن دنوں مجھ سے

کوئی نفرت نہ کرے، اظہار دشمنی نہ کرے وہ دن عجیب اور غیر معمولی لگتے ہیں کسی کمی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اپنا وجود ادھورا اور نامکمل سا لگتا ہے نفرت وہ واحد جذبہ ہے جس کی وجہ سے ہم دوسرے جذبوں سے آشنا ہوتے ہیں اور زندگی کے اصل رنگوں، حیات کی تلخ حقیقتوں سے ہمارا آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے وہ کیسے؟ وہ بھئی ایسے کہ ہم دوستوں اور دشمنوں کی محبتوں اور نفرتوں کے ساتھ ساتھ منافقوں سے بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں فیصلے جلد اور صحیح کرنے میں مدد ملتی ہے اور یوں مسائل بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جبھی مجھے نفرت سے محبت ہے اور ان آشنائیوں سے لگاؤ ہے، ایک انس سا ایک مستقل رابطہ سا محسوس ہوتا ہے۔

میری زندگی میں رابطے بہت اہم ہیں وہ چاہے ذہنی سطح پہ ہوں یا علمی فکری اور عملی سطح پہ۔ میں ان کا احترام کرتی ہوں جس طرح میں دوسروں کی محبتوں اور خوبصورت جذبوں کا احترام کرتی ہوں۔

جس طرح میں نے اپنے راستوں میں آنے والوں کی جائز خواہشات کا احترام کیا ہے مگر میری خواہشات جن کے مطابق میں اپنی مرضی کے کچھ پل تو گزار سکتی ہوں (ساری زندگی نہیں) کیونکہ ان لمحوں کے بعد کی ساری گھڑیاں مجھے دوسروں کے حوالے کرنی پڑتی ہیں۔ میں اپنی مرضی سے گزارے ہوئے اس کم وقت کو ہی اصل حقیقت اور زندگی کا بڑا سچ کہتی ہوں مگر دوسرے لوگ اسے غلطی کہتے ہیں ان کی سوچ کی اس غلطی پہ مجھے اپنے بچاؤ کے لیے یہی کہنا پڑتا ہے کہ آئندہ جلد آنے کی کوشش کروں گی دیر سے نہیں آؤں گی مگر وہ آئندہ کب آئے گی میں بھی نہیں جانتی ——— وہ بھی نہیں جانتے ہاں ہم دونوں ہی اس آئندہ کو چاہتے ضرور ہیں اس کا انتظار بھی کرتے ہیں مگر! آپ کہیں گے کہ میں جلد آنے کی کوشش نہیں کرتی ہوں گی، آپ یہ بات اس لیے کہیں گے کہ آپ مجھے جانتے نہیں یا پھر ٹھیک سے جان نہیں سکتے۔

تو سنیے! میری ہر دوسری کوشش اور خواہش ناکام ہو جاتی ہے اب میں کیا کروں؟ اگر میری کوشش اور میری خواہش لوگوں کی خواہشوں اور سوچوں سے الگ ہو کے چلتی ہے، یا کچھ قدم آگے یا کچھ قدم پیچھے مگر اُن کے برابر نہیں تو اس میں بھلا میرا کیا قصور؟ اب اگر میری خوشیوں، آرزوؤں اور تمناؤں سے اس دھرتی نے اس دھرتی کے رب کی مخلوق نے ضد کر رکھی ہے تو میں ان کی ضد کیسے توڑوں؟ ضد کوئی کھلونا تو ہے نہیں اور پھر ایسی ضدیں تو نہ ٹوٹنے والی ہوتی ہیں۔ جیسے کچھ گلاسوں پہ UNBREAKABLE لکھا ہوتا ہے اور وہ واقعی کہیں پہ نہیں ٹوٹتے

یا پھر اس وقت ٹوٹتے ہیں جب کوئی فائدہ نہیں ہوتا اُن کے ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے سے کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہی چیز اگر وقت پر ٹوٹ جاتی تو بہتر ہوتا ـــــــ کتنا اچھا ہوتا۔ مگر میری زندگی میں وقت پر کبھی کوئی کام صحیح ہوا نہیں پھر یہ کیسے ہو؟

دیکھیے ناں! کبھی وقت پر نہ تو میں سکول جا سکی ہوں اور ـــــــــــــــــــــــــــــــ نہ ہی کوئی اور کام کر سکی ہوں اس کی وجہ میرے گھر والے ہیں انہوں نے کبھی میرے کسی کام کو وقت پر نہیں ہونے دیا نہ ہی کسی کام کو وقت پر کرنے کی ہونے کی تربیت کی ہے۔ میرے مزاج میں تندی و تیزی کم بے قاعدگی اور کاہلی زیادہ ہے۔ میری ماں کا کہنا ہے کہ میں اس پر بالکل بھی نہیں گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں طبیعتاً اور فطرتاً والد پر زیادہ گئی ہوں۔ ممکن ہے مشابہت اسی وجہ سے ہو۔

میرے والد قدرے خاموش طبع اور نرم خو واقع ہوئے جبکہ والدہ ان کے برعکس۔ حیرت ہے کہ ان دونوں نے کس طرح اتنے برس ایک ساتھ گزار دیئے عموماً تو عورتیں یہ فقرہ کہتی ہیں کہ ہم ہی تھے جنہوں نے گزارا کر لیا اگر کوئی اور ہوتی تو سمجھ آ جاتی۔ مگر میں یہ فقرہ اپنے والد کے مونہہ سے سننے کی خواہشمند رہی۔ اگر کبھی وہ کہہ دیتے یا کہہ دیں تو وہ حق پر ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی خاموشی میں عمر بھر اس گزارے اور سمجھوتے بلکہ مجبوری کو جھیلا ہے۔ برداشت کیا ہے۔ اپنے جگر کا خون اس رشتے کی آبیاری کے لیے دیا ہے۔ وہ رشتہ جو وقت اور زمانے کی کتاب نے ان کے نام پر لکھ دیا اگر چاہتے تو اس پر سیاہی پھیر سکتے تھے لکیر لگا سکتے تھے۔ اسے اپنی زندگی سے مٹا سکتے تھے۔ اس صفحے کو پھاڑ سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کر دیتے تو آج شاید میں زندگی کی سزاوار نہ ہوتی۔ اگر وہ ایسا کر دیتے تو کیا ہوتا؟ کیسا ہوتا؟ اچھا یا بُرا۔ اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتی اس لیے نہیں کہ میں سچ بول نہیں سکتی بلکہ اس لیے کہ میں یہاں سچ بولنا نہیں چاہتی میں نہیں چاہتی کہ میری ذات سے کسی بھی فرد کو یا کائنات کی کسی بھی شے کو نقصان پہنچے۔

میں حقیر سے حقیر شے کو بھی اپنی کسی بات سے اپنے کسی فعل یا عمل سے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ میں رنج سے واقف ہوں۔ میں بہت اذیت پسند واقع ہوئی ہوں۔ میں نے اذیتوں کو اپنے رگ و پے میں جوان ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کو سرکش ہوتے دیکھا ہے اُن کی امنگوں کو پلتے دیکھا ہے پھر ان کے ارادوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے میں نے جن خوابوں کی زندگی چاہی وہ سبھی بے وفا نکلے اس لیے کہ سب میرا نہیں میری ماں کا کہا مانتے رہے اس کے حکم پر جان دیتے رہے۔ میں نے

جب ٹیکسلا میں سرکپ کا مینار دیکھا تھا تب مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے سارے خواب خیال کٹے ہوئے سروں کی صورت میں ڈھل کر میرے سامنے آ گئے اور مینار بنا کر مجھے خوفزدہ کر رہے ہوں کہ لو دیکھو، یہ تمہارے خواب ہیں، تمہاری زندگی کے وہ سچ ہیں جو آج تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہے ہیں ـــــ بولو ـــــ کیا اب بھی تم کبھی خواب دیکھو گی، کوئی خواہش کرو گی؟ کیا اب بھی تمنا کی فصل تمہاری من دھرتی پہ لہلہائے گی؟ کیا اب بھی تم سوچتی ہو کہ کسی آزمائش میں کامیاب ہو جاؤ گی؟ کیا اب بھی تم چاہتی ہو کہ مزید رسوائی، شکست کا سامنا ہو۔ بربادی اور ناامیدی کی خاک تمہارے پاؤں کے تلوؤں پر جم جائے اور کبھی نہ اترے۔ تھکن اور دکھ کی دھول میں لتھڑی زندگی تمہارے کس کام آئے گی؟ تب واپسی پر میں نے سوچا تھا نہیں اب نہیں کبھی نہیں۔ کوئی بھی امید نہ باندھوں گی، کوئی بھی خواب نہ دیکھوں گی۔ کچھ نہ مانگوں گی کبھی کسی آرزو کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھوں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ امیدیں بندھ بندھ کے ٹوٹتی رہیں، خواب الٹی سیدھی تعبیروں کے دکھ دیتے رہے۔ ہاتھ دعائیں مانگتے رہے۔ آرزو کی طرف بھی دیکھتی رہی اور اندھی راہوں پہ چلتی رہی زندگی بہت کچھ کرتی رہی ـــــ گزرتی رہی ـــــ منظر بدلتے رہے۔ واقعات کے سلسلے ٹوٹتے اور جڑتے رہے۔ کہتے ہیں کبھی وقت ایک سا نہیں رہتا مگر میں نے دیکھا کہ کئی وقت بالکل ایک سے تھے ایک دوسرے کی نقل مگر ایسی کہ اصل کا گمان ہو۔ ہاں واقعات کے کردار ضرور بدلتے رہے، چہرے بدلتے رہے مگر ان کے رویے ایک سے رہے۔ ماں کے جملے یکسانیت کا شکار رہے۔

"عجیب لڑکی ہے گھر سے نکلتی ہے تو آنا بھول جاتی ہے۔ واپسی کا تو جیسے کوئی فکر ہی نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں کیا خوف ہے کہ روشنی میں آنے سے گھبراتی ہے۔"

ہاں پتہ نہیں کیا بات ہے؟ مگر کوئی ایسی بات ہے جو میں بہت عرصے سے سمجھ نہیں پا رہی۔ خوف کیوں ہے؟ کس چیز کا ہے؟ نہیں جانتی۔ پتہ نہیں خوف ہے بھی کہ نہیں!

بس دن اور اس کی روشنی مجھے پسند نہیں بری لگتی ہے اس برے لگنے کی وجہ سے بھی واقف نہیں ہوں۔ مگر ایک بے چینی ایک اضطراب اور کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔ سبھی چہرے بدنما اور جھوٹے لگتے ہیں۔ جیسے نفرت اور منافقت کی کائی جمی ہو۔ مگر شام کے پھیلتے سائے دن بھر کے دکھوں سے اذیتوں سے جیسے نجات دلا دیتے ہیں مگر نہیں یہ بھی وہم سا لگتا ہے یا خوش فہمی کہہ لیں۔

رات تو سارے دکھ درد کے ٹانکے ادھیڑ کر بھید عیاں کر دیتی ہے، ہر زخم نمایاں کر دیتی

ہے سسکی، آہ، آنسو بھی تو موقع پاکر سامنے آجاتے ہیں جیسے انتظار میں رہے ہوں دن بھر۔ شام پہ رات کی چادر کتنی بھلی لگتی ہے۔ مہربان ماں کی طرح رات کی سیاہی مجھے اپنی گود میں چھپا لیتی ہے۔ رات کو سڑکوں پہ پیدل چلنا مجھے کتنا اچھا لگتا ہے۔ اسلام آباد کی سڑکوں نے مجھے ہمیشہ آسرا دیا ہے بڑھ کر میری بانہوں کو تھاما ہے۔ میرے بکھرے وجود کو سمیٹا ہے۔ ان کے احسان کا بدلہ تو میں کبھی چکا نہیں سکتی۔ محبت سکون ایک خوشگوار احساس میرے اندر باہر رچ بس جاتا ہے۔ بھٹکتے بھٹکتے جس طرح کسی راہی کو منزل مل جاتی ہے ایسے ہی مجھے اسلام آباد کی سڑکیں اچانک مل گئی تھیں۔ لاہور سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود ہمیشہ میرا وہیں رہ جانے کو جی چاہا، کھو جانے کے لیے مگر... مگر وفا کی پاگل ہوائیں مجھے واپس اسی شہر میں لے آتی ہیں اور پھر شہر سے اس در کی طرف زبردستی میرے پاؤں مجھے کھینچ لاتے ہیں جس میں داخل ہو کر میں خود کو محفوظ تصور نہیں کرتی جبکہ اس گھر میں میری حفاظت کا دعویٰ کرنے والا میرا ایک بھائی بھی رہتا ہے۔ ہاں وہ بھائی جو اس گھر میں ہمیشہ ایسے رہا جیسے بڑے ہوٹلوں میں نہایت معزز مہمانوں کو عزت و احترام سے رکھا جاتا ہے۔ ہر وقت ملازم اس کا حکم ماننے اس کو خوش کرنے اور اس کی خاطر مدارت کرنے میں مصروف رہتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو مہمان کی ناراضگی کا باعث بنے۔ کہیں ہماری کوئی حرکت اس کے ماتھے پہ بل نہ ڈال دے اس کی طبیعت پہ گراں نہ گزرے اور معزز مہمان نہ جانتے ہوئے کہ یہ سب میرے حکم کے غلام ہیں جیسا بھی سلوک کروں گا یہ مسکرا کر قبول کریں گے کہیں گے ہم آپ کے شکر گزار ہیں آپ نے ہمیں میزبانی کا شرف بخشا ہم آپ کی خدمت کے لیے ہمہ وقت حاضر ہیں حضور! آپ ارشاد فرمائیے۔ ہم آپ کی نظر کرم کے منتظر ہیں۔ ہم آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان سے بھی گزر جائیں گے۔ ہم صرف آپ ہی کے لیے اور آپ ہی کی وجہ سے زندہ ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے الہ دین کے چراغ رگڑنے پہ جن حاضر ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس گھر میں ہماری حیثیت چراغ کے جن سے زیادہ نہیں ہے۔ پتہ نہیں بیٹوں کو ہمارے معاشرے میں اتنا افضل اور اعلیٰ کیوں سمجھا جاتا ہے؟ ان کی خوشی کو ہی عزیز کیوں رکھا جاتا ہے۔ بیٹیوں کی خوشی اور خواہش اتنی عزیز کیوں نہیں ہوتی۔ آخر بیٹوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد تو وہ بھی ماں باپ کو OUTSIDERS قرار دیتے ہیں۔

جن کا اس گھر سے ماضی میں کچھ رشتہ ضرور ہوتا ہے حال اور مستقبل میں وہ اس رشتے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے اور ان کی حیثیت اپنے ہی گھر میں

نوکروں سے بھی کم تر ہو جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ پھر کیوں ماں باپ لڑکوں سے امتیازی سلوک کرتے ہیں؟ ہر بات میں ہر مسئلے اور معاملے میں رائے کا اولین حق لڑکے کو دیا جاتا ہے جبکہ ثانوی حیثیت لڑکی کو حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات تو اس کی کوئی حیثیت بھی نہیں ہوتی۔ اس کے وجود کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے۔ وہی نظر انداز کیوں کی جاتی ہے؟ ہمیشہ جلاوطنی کا حکم لڑکی کو ہی کیوں سنایا جاتا ہے؟ اس سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ وہ حکم ضرور مانے گی۔ انکار نہیں کرے گی۔ اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں میں اس کی رائے کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی جاتی خیر لڑکی کی ضرورت تو کہیں بھی نہیں سمجھی جاتی اور جس گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے اس گھر میں اسے مجبوری سمجھ کر قبول کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ضرورت ہمیشہ لڑکے کی ہوتی ہے جسے آپ سونے کا نوالہ عمر بھر کھلاتے رہیں اور پھر وہ دن آئے گا کہ وہ آپ کے نوالوں کا حساب رکھتا رہے۔ جیسے کہ مائیں بیاہ کرتے وقت آنے والے جہیز کا حساب رکھتی ہیں۔ اور اس میں عزت جانی جاتی ہے کہ دولت ہی معیار ہے۔ اور ان چیزوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پتہ نہیں ہم کب تک غلط لفظوں اور غلط معنی کو استعمال کرتے رہیں گے۔ کب جانیں گے کہ اہم اور غیر اہم اشیاء درحقیقت کون سی ہیں۔ ہمیں نئے سرے سے ان خانوں کو پُر کرنا ہوگا ورنہ ہم ترقی نہیں کر پائیں گے۔

ارے! میں تو یہ بھول ہی گئی کہ ہم ترقی کب کرنا چاہتے ہیں؟ ضروری نہیں کہ لغت کے تمام اچھے الفاظ کے معنی بھی ہم جانتے ہوں اگر جانتے ہوں تو ان کا صحیح استعمال بھی کرتے ہوں۔ اپنے کہے لفظوں پہ عمل بھی کرتے ہیں یہ ضروری نہیں ہم نے سب کچھ کرنے کا ٹھیکہ تھوڑا ہی لے رکھا ہے۔ دوسرے لوگ بھی کچھ کام کریں۔ سب کام کرنے کا وقت اور فرصت ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمارے پاس تو اپنے لیے بھی وقت نہیں ہوتا ہے۔ دوسروں کے لیے کیا ہوگا۔

ہونے کو تو میرے پاس بھی وقت نہیں ہوتا۔ اس لیے نہیں کہ میں ایک صحافی ہوں اور اس لیے بھی نہیں کہ میں ایک ماہنامہ پرچے سے منسلک ہوں۔ بہت زیادہ دنوں تک اپنے شہر سے باہر نہیں رہ سکتی۔ مجھے واپس آنا پڑتا ہے۔ جہاں میرا نام میری تلاش میں بھٹک رہا ہوتا ہے یا پھر میرے نام کا کوئی حصہ جسے بھول جاتی ہوں جس کے نہ ہونے سے مکمل نہیں ہو سکتی مکمل تو کوئی شے بھی نہیں ہوتی مگر ہاں نام کا ادھورا پن نظر آجاتا ہے۔ شخصیت کا، انسان کا ادھورا پن نظر آنے میں کچھ وقت لگتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص عمر بھر نہیں جان سکتا کیونکہ سبھی اپنے آپ سے علیحدہ ہوئے پھرتے ہیں، دوسروں کی خاطر جیتے مرتے عمر بتا دیتے ہیں اور اپنے لیے جینا بھول

جاتے ہیں جس طرح میں بچپن میں کہیں اپنا آپ بھول گئی تھی دوسرے دن بھی مجھے واپس گھر پہنچا دیا گیا مگر میرے اس کھوئے ہوئے حصے کا علم کسی کو نہ ہو سکا تھا۔ اس کی مکمل تفصیل کو تو میں فراموش کر چکی ہوں بس ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ میرا خیال ہے تب میں اپنی زندگی کی علیحدگی کو دوسرے لوگوں سے علیحدہ کرنے اور سمیٹ کر رکھنے کا جتن کر بیٹھی تھی۔ افسوس میری یہ چوری پکڑی گئی۔ میں ان دنوں میٹھی چیزیں چرایا کرتی تھی اپنی مرضی کے خوابوں اور کچھ لمحوں کی طرح۔ کل کی چوری تو نظر آ جاتی تھی مگر آج کی چوری کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کل ہر چھوٹی بڑی چوری پر خوب ڈانٹ پڑتی خوب مار پڑتی مگر عادت کبھی نہیں چھٹ سکی۔ نہ ڈانٹ کھانے کی نہ مار پڑنے کی اور نہ ہی چوری پکڑے جانے پر رونے کی۔ اب چوری پکڑی جاتی ہے سزا ملتی ہے، آنکھیں خشک رہتی ہیں سارے آنسو اندر گرتے جاتے ہیں۔ آنکھ نہ شکوہ کرتی نہ گلہ۔

کس سے کرے گی؟ کیا کوئی ان شکووں اور گلوں کو سمجھے گا۔ جانے گا، جواب دے گا؟ اگر نہیں تو پھر شکوہ کیسا؟ میں نے صرف اپنے آپ سے شکوہ کرنے کا حق نہیں چھینا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے یہ حق چھینا نہیں گیا۔ جس طرح میں آج تک اپنی ماں سے اپنے حصے کا پیار، نہیں چھین سکی دراصل ماں مجھے دینا بھول گئی تھی۔ وہ اکثر میری چیزیں مجھے دینا بھول جاتی ہے چاہے وہ کھانا ہو یا کسی کے آنے کی اطلاع ہو یا کسی کے فون کا پیغام ہو۔ اس میں اس کا قصور کیا؟ وہ ہر بات کو بھول جاتی ہے سوائے ان باتوں کے جن پر وہ بحث کرنا یا جھگڑنا چاہتی ہو۔ یا پھر وہ باتیں جنہیں وہ سننا چاہتی ہو، یا جو لوگوں سے اس نے سنی ہوں۔ وہ باتیں سن کر خود ہی کوئی رائے قائم کر لیتی ہے اور پھر دوسرے لمحے خود ہی فیصلہ بھی کر لیتی ہے جسے اگر وہ چاہے تو بدل دیتی ہے ورنہ وہی فیصلہ قبول کرنا پڑتا ہے اگر نہ قبول کیا جائے تو نتائج کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی ظاہر ہے ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ میں نے مصلحتاً فیصلوں کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں ان پر نہ تو عمل کرتی ہوں اور نہ ہی میرا کوئی ردِ عمل ہوتا ہے پھر بھی ماں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میں قدرے بہتر ہوتی جا رہی ہوں۔ ماں کی سوچ میری سوچ سے بہت حد تک مختلف ہے۔

دراصل سب ماؤں کی طرح میری ماں بھی دولت کو معیار سمجھتی ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتی۔ اگر میں عام سی لڑکی ہوتی جس کے پاس ہر وہ ہنر ہوتا جو گھریلو لڑکی ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے مگر ان سب میں سوچنے والا ذہن نہ ہوتا۔ ذہن اپنی من مانی کرتا ہے اور دل اپنی کہانی کہتا ہے جو دل کی بات مانتے ہیں وہ ذہن کی بات نہیں مان سکتے اور ذہن کی بات ماننے والے

دل کی باتوں پر کان نہیں دھرتے جو دونوں کی بات سنے وہ مشکل میں گرفتار ہوتا ہے۔ دل بہت نادانی کرتا ہے کہ جذباتی ہے جبکہ ذہن جذبوں کا احترام کرتے ہوئے دانش سے مشورہ کر کے جواب دیتا ہے۔ یہ ہر شخص کی اپنی مرضی ہے کہ وہ کسی کی بات مانے؟ کس کی بات پر عمل کرے کس نتیجے کا خواہشمند ہو۔ ہم تو صرف دیکھتے رہ جاتے ہیں گزرتے لمحوں کو، خوابوں کو، جیتنے ہارنے والوں کو، اس لیے کہ ہم سب محض تماشائی ہیں۔ خاموش تماشائی۔ ہمیں نہ اب کسی بات پر رونا آتا ہے نہ کبھی ہنس سکتے ہیں۔ بس آنکھوں کی پتلیوں کو حکم دیتے ہیں کہ دیکھتی جاؤ اور سارے مناظر عکس بند کرتی جاؤ کبھی وقت آنے پر انہیں پھر دیکھیں گے اور اظہار کریں گے تم صرف اپنا فرض نبھاؤ۔ ہم بھی نبھائیں گے مگر آج نہیں کل۔ آج تو ہم خاموش تماشائی ہیں۔ ہمارے اندر باہر خاموشی ہے، صرف اور صرف خاموش! ایک طویل اور تھکا دینے والی خاموشی ـــــ جس کا زہر ہم اس وقت تک دل میں اتارتے جائیں گے جب تک یہ امرت نہ بن جائے۔ ہمیں کچھ مت کہنا۔ بس تم سننا اور سمجھنا۔ اس خاموشی کو جو آج ہے کل تھی اور شاید کل بھی ہوگی۔ اور پرسوں بھی۔ ممکن ہے اور کئی برسوں تک بھی رہے گی۔ ہمارے ساتھ ہر پل جیئے گی یہ خاموشی۔ گہری اور طویل خاموشی ـــــ خاموشی ـــــ خاموشی ـــــ خاموشی!

بازگشت

اکتوبر ـــــ آج میری سالگرہ کا دن تھا مگر جب بھی یہ دن آتا جیسے میرے اندر دکھ کی کچھ اور گرہیں ڈال دیتا، کبھی نہ کھلنے والی گرہیں۔ پتہ نہیں ان گرہوں نے مجھ سے کب دوستی شروع کی شاید اس پل سے جب، پہلی بار آنکھ کھول کر اپنے اردگرد کی دیواروں کو دیکھا۔ ہاں تب دیواریں بھی مجھے دیکھ رہی تھیں، حیرت سے، خوشی سے، رنج سے یہ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا مگر آج جب دیواریں مجھے سہارا دیتے دیتے بوڑھی ہوگئی ہیں آج میں ان کے تمام تاثرات ان کے چہرے سے پڑھ کر جان لیتی ہوں مگر دیواریں تنہائی پسند نہیں تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ کچھ چلتے پھرتے سائے تھے خوفناک اور بڑے بڑے سائے جن سے آج بھی نہ میں آنکھ ملا کر بات کر سکتی ہوں اور نہ ہی میرا قد ان کے قد جتنا لمبا ہو سکتا ہے میں ابھی تک ان سے خوفزدہ ہوں ـــــ تب بھی تھی مگر اس خوف کو سمجھی نہیں تھی۔ آج بہت کچھ سمجھ گئی ہوں یہ بھی کہ میں منحوس کیوں تھی؟ اس لیے کہ میں لڑکی تھی اس لئے کہ میری پیدائش کے دن اور وقت کے ساتھ ساتھ میری ایک جڑواں بہن کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ جسے کچھ ہی دیر بعد مٹی کے ہاتھوں میں سونپنا پڑا تھا وہ مٹی شاید اسے بھول چکی ہو مگر مٹی سے بنے انسان اسے بھول نہیں سکے اور اس کی یاد کی سزا مجھے ملتی رہی ہے۔ کاش وہ زندہ ہوتی کتنا اچھا وقت گزرتا۔ ہم دونوں ساتھ پڑھتے لکھتے، کھیلتے کودتے، ہنستے روتے، پل پل جیتے مرتے ممکن

ہے ایسا نہ ہوتا وہ کسی اور سکول میں پڑھتی، کسی اور سہیلی کے ساتھ کھیلتی (بہن سہیلی تھوڑا ہی ہوتی ہے وہ تو صرف اور صرف بہن ہوتی ہے) وہ ہنستی رہتی، روتی رہتی مگر مجھ سے دور، مجھ سے بچھڑ کر علیحدہ ہو کر کہ اسے میرے ساتھ ہنسنا یا میرے سامنے رونا اچھا نہ لگتا ہو —— وہ اپنے حصار میں قید رہتی، خود ہی جیتی مرتی، خود سے لڑتی جھگڑتی، جنگ کرتی رہتی —— اور کتنا عجیب لگتا ہے یہ سوچنا کہ اگر وہ ہوتی تو ہم اکٹھے بیٹھ کر لڈو کھیلتے۔ ایک دوسرے کی گوٹ پٹ جاتی تو خوش ہوتے گھر والوں سے چھپ چھپ کر درختوں پر چڑھتے، کبھی جامن توڑتے، کبھی کچی امبیاں توڑتے خوب مزے لے لے کر کھاتے جیسے چٹخارے سے املی کھائی جاتی ہے۔ اپنے بڑے بھائی سے ٹافی اور چاکلیٹ کی فرمائش کیا کرتے۔ شام کو آئس کریم کھانے کے شوق میں بھاگ بھاگ کر ان کے کام کرتے۔ لالچ بھی کتنی ظالم چیز ہے انسان کیا نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے جب میں بچپن میں بلکہ بچپن سے جوانی تک میں اپنے بھائی کے جوتے اس لیے پالش کرتی تھی کہ وہ خوش ہو کر مجھے ایک نوٹ دیا کرتا تھا۔ ہاں وہ نوٹ جو ایک روپیہ سے شروع ہوا اور پھر پانچ تک پہنچا۔ یہ میرا وہ محنتانہ ہوا کرتا تھا جو میں خوشی سے وصول کیا کرتی تھی بلکہ آج تک وصول کرتی ہوں مگر اب پتہ چلا کہ اسے محنتانہ نہ سمجھنا اور لینا زیادتی ہے یہ تو بڑے لوگوں کی TIP یعنی بخشش ہوا کرتی ہے۔ احسانِ عظیم ہے ان کا، جو وہ چھوٹے لوگوں پہ کرتے ہیں بلکہ دوسرے معنوں میں وہ اس رقم کو لوگوں کا دماغ خراب کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ انہیں روپے کا لالچ ہو اور رقم وصول کرتے رہنے کی عادت بد پڑے۔ بس یہ سمجھئے کہ میری عادتیں بگاڑنے میں ان بڑے لوگوں کا بہت ہاتھ ہے۔ آپ کہیں گے وہ کیسے؟ وہ ایسے کہ جب بھی گھر والے کہیں باہر جاتے وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں جاتے تھے وجہ ایک تو میری بدصورتی (ان کے خیال کے مطابق) دوسرا میری بدسلیقگی تیسرا میری بدمزاجی اور چوتھی میری متضاد شخصیت کہ نہ جانے کب کیا کہہ دے یا تمام وقت گم سم بیٹھی رہے۔ دراصل مجھے کبھی بھی کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں آیا بلکہ ڈھنگ کا کوئی کام بھی کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ نہ مجھے تہذیب و ادب سے واسطہ رہا ہے۔ تھوڑی منہ پھٹ بھی واقع ہوئی ہوں حق بات کہنے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتی کہ مدمقابل کون ہے؟ اب چاہے وہ میرے گھر والے ہوں میرے ساتھی ہوں۔ دوست ہوں افسر ہو یا کوئی اور شخص۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ میرا کام صاف بات منہ پر کر دینا ہے چاہے یہ بات کہتے ہوئے مجھے کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے اور بار بار نقصان اٹھانے پر بھی مجال ہے جو رتی برابر بھی میرے

رویّے میں فرق آیا ہو کیونکہ منافقت نہ میں برداشت کر سکتی ہوں اور نہ ہی کسی دوسرے کے ساتھ کر سکتی ہوں۔ منافقوں اور کاذبوں پہ حیران ہو سکتی ہوں، کڑھ سکتی ہوں، خود کو پریشان کر سکتی ہوں مگر خود منافقت کر نہیں سکتی، حتیٰ کہ ذرا سا جھوٹ بھی نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے کی کوشش کبھی بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی فوراً پکڑی جاتی ہوں اور یوں ذلت و رسوائی سے دامن بھرتی ہوں۔ صرف دامن ہی نہیں بھرتی بلکہ فائلوں کو بھرنے کا کام بھی خوب کر لیتی ہوں، نوکریاں کرنا اور چھوڑ دینا درخواستیں بھجوانا اور جواباً معذرتی خطوط وصول کرنا میرا مشغلہ ہے۔ اس لیے کہ میں یہ مانتی اور جانتی ہوں کہ ہر شکست کے پیچھے کوئی نہ کوئی جیت چھپ کے بیٹھی ہوتی ہے۔ آپ کے انتظار میں دن گزار رہی ہوتی ہے کب آپ اسے تلاش کریں اور وہ اپنا آپ آپ کے سپرد کر دے سو میری تلاش کا سفر بھی جاری ہے۔ سفر میں کہیں کہیں عارضی طور پر کچھ وقت کے لیے پڑاؤ بھی ڈالنا پڑتا ہے میرے سفر میں بھی کئی ایسے مقامات آئے ہیں۔ جہاں میں ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ کچھ لمحوں کے لئے رک جاتی ہوں۔ رک کر پیچھے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ آگے بڑھنے کا حوصلہ مل جاتا ہے۔

پہلے میں ایک ماہنامے میں ملازم تھی اس کے بعد ایک ہفت روزہ پرچے سے منسلک ہوئی میرا کام فیچر رائیٹنگ کا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ مستقل سلسلے بھی میرے کام کا حصّہ تھے۔

گو اس وقت تک میں مشہور و معروف ادبی و نیم ادبی رسائل و جرائد روزناموں میں بطور فری لانسر کے لکھتی رہتی تھی مگر صحافت کی باریکیوں سے آشنا نہ تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ مضمون کے بعد وہ کن مراحل سے گزرتا ہے اور کس طرح شائع ہو کر سامنے آتا ہے۔ میں کتابت کی الف بے پازیٹو کاپی پیسٹنگ، پرنٹنگ، پراسنگ، بائنڈنگ ان تمام معاملوں کے بارے میں لاعلم تھی۔

اس شعبے میں آ کر میں نے بہت سے چہرے دیکھے، بہت کچھ سیکھا۔ میں نے جان لیا کہ تجربوں کے زہر کو پی کر ہی انسان زندگی کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتا ہے۔ میں بھی اس بھٹی میں ڈال دی گئی تھی۔ میری نجات کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ سب دروازے بند ہو چکے تھے اور مجھے انہی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے مر جانا تھا۔ آپ سوچیں گے کہ کوئی اور راستہ کیوں نہیں تھا؟ اس لیے نہیں تھا کہ مجھے اس راستے پہ چلنے کے لیے بہت مشکل سے اجازت ملی تھی اس لیے بھی کہ لفظ کی اس دنیا میں آ کر جانا آسان نہیں۔

اب تو واپس جانے کا وقت بھی نہیں۔ ہاتھ تھا مجھے اسی صحرا کی خاک چھاننا تھی۔ اسی صحرا میں میں جہاں برہنہ پا برہنہ سر تپتی دھوپ میں پھرتی رہی تھی۔ میں پیاس کی شدت سے گھبرا کر پانی کی

تلاش میں ایک قدم چلتی تھی مگر۔ ہائے رے میری آبلہ پائی تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ میں وقت کے دریا پہ پیاسی ہی مر جاؤں گی مگر منزل کی تلاش میں بھٹکنا ہی پڑتا ہے۔ میں اپنی نظر میں سرخرو ہونا چاہتی تھی۔ اپنے ساتھ کئے ہوئے وعدے ایفا کرنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میں اپنے لیے ایک ایسی مثال بن جاؤں کہ دوسرے بھی مجھے مشعلِ راہ تصور کریں، راہنما جانیں، میرے اصولوں کی پیروی کریں۔ میرے متعلق سوچتے ہوئے ان کی آنکھیں محبت سے عقیدت و احترام سے جھک جائیں۔ میں میرا کی طرح جوگ لینا چاہتی ہوں۔ میں پریم دیوانی ہونا چاہتی ہوں مگر درد کوئی نہیں سمجھتا۔ کوئی نہیں جانتا۔ سب اپنے ہی بارے میں سوچتے ہیں، کوئی میرے بارے میں نہیں سوچتا کوئی میری فکر نہیں کرتا۔ سب اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ مگر نہیں۔ یہ مثبت رویہ نہیں ہے۔ کسی اور کو پرواہ ہو بھی کیسے سکتی ہے؟

سب لوگ ایک سے ہیں۔ جو دوسروں کے جوتے پہن کر اپنا قد بڑھانا چاہتے ہیں۔ سب لوگ۔ کیا سب لوگ! نہیں ان سب لوگوں میں وہ تو شامل نہیں ہے۔ وہ جو ان سب سے ہٹ کر چلتا ہے۔ جس کا نام علی ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں ہے۔ کہیں تمہارا وہم نہ ہو میناؔ سب انسان جلد یا بدیر اپنے اصل روپ میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان کا گھٹیا پن ان کی بُری ذہنیت ان کی حرکتوں۔ ان کے لہجوں ان کی باتوں کے راستے باہر آ جاتا ہے۔ اور وہ سب "وہ سب" لیر و لیر ہو جاتے ہیں۔ سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے۔ واضح ہو جاتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ خود حیران رہ جاتے ہیں۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہ ہی ہیں۔ وہی جو پہلے ایسے نہیں تھے۔ دنیا والوں کی نظر میں محترم، معتبر تھے پھر اچانک یہ آندھی آئی کہ ان کے جسم سے لباس چھین کر لے گئی اور وہ خزاں رسیدہ شجر کی مانند تنہا برہنہ رہ گئے۔ کوئی بھی تو نہیں جو انہیں ڈھانپ سکے کوئی بھی نہیں!!

مجھے لگتا ہے علی ان لوگوں جیسا نہیں ہے۔ میں جو بہت سے چاہنے والوں اور چاہتوں سے خاموشی کے سہارے بھاگتی رہی، بھاگتی رہی۔ علی کے سامنے آ کر کیوں گر پڑی۔ کیوں میرے قدم زمین نے تھام لئے۔ کیوں! آخر اس میں ایسا کیا تھا کہ میں اپنے خواب اپنی زندگی کے چرائے ہوئے لمحے اسے سونپنے پہ مجبور ہو گئی۔ شائد ان راہوں نے اس کی صدا سن لی ہو گی، اس کی دعا قبول کر لی ہو گی۔ جہاں پر ہم دونوں کی تنہائیوں اور اداسیوں کو ہمارے قدموں کی چاپ سے لپٹی دھول نے جانا تھا۔ ورنہ ہم دونوں ہی تھے جو مختلف اوقات میں ان راہوں پر تنہا دور تک چلتے

رہے تھے اور ہم نے کبھی نہ جانا تھا ہم ملیں گے اور اس طرح؟ ہمارا ملاپ تو پل بھر کا تھا مگر جدائی صدیوں کی ـــــ پھر اتنی طویل مدت کے بچھڑے ہوئے ان چند گھڑیوں میں کیسے حساب دیتے؟

فاصلے برسوں کے تھے اور ملاپ پل بھر کا۔ جذبوں کی شدت کبھی کبھی قوتِ گویائی چھین لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہاں علی بہت کچھ کہنے کی کوشش میں کچھ نہ کچھ کہتا رہا۔ پھر بھی وہ سب کچھ وہ بہت سی باتیں اس کے دل میں ہی رہ گئیں جو وہ میرے حوالے کرنا چاہتا تھا وہ سارے لفظ، سارے جذبے تو ایک دوسرے کی امانت تھے اور پھر امانت حقدار کو پہنچا دینی چاہیے۔ مگر کبھی کبھی انسان امانت دینا بھول بھی جاتا ہے۔ ملاقات بہت دیر کے بعد ہو اور اہم ہو تو انسان اپنی ہستی بھی بھول جاتا ہے۔ مجھے ان لمحوں میں یہ احساس ہوا کہ لفظ باوجود کوشش کے جذبوں کی زبان نہیں بن سکتے۔ محبت محسوس کی جا سکتی ہے مگر اس کا اظہار..... محبت تو ایک ایسی کیفیت ہے جو نگاہوں کے چہرے سے دیکھی جا سکتی ہے، سمجھی جا سکتی ہے، مگر یہاں لفظ کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر ختم بھی نہ ہو تو کم ضرور ہو جاتی ہے۔ محبت تو سکھ کی وہ پھوار ہے جس میں انسان کا اندر باہر بھیگ جاتا ہے اور آخری سانس تک بھیگتے رہنا چاہتا ہے۔ ملن کے خوبصورت لمحے شگفتہ پھولوں کی مسکان بن کر کھل اٹھتے ہیں۔ اُس کے دیے کی لو میں ہم ایک دوجے کا چہرے دیکھ رہے تھے۔ روح کی عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ روح کے تمام رازوں کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔ تمام تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے ورنہ دلوں کے سودے سچے نہیں ہوتے۔ سچ محبت کے راستے کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہم اس ملاپ پہ خوش تھے۔ حیرت ہمارے چہرے دیکھ رہی تھی اور خوف چھپ کر کہیں بیٹھ گیا تھا۔ ہم جذبوں کی سچائی میں، برسوں جدائی کے ایندھن میں سلگ سکتے تھے شاید ایک نظر دیکھنے کے بعد جل کر راکھ ہو جاتے۔ ہم نے ایک نظر کے لیے عمر بھر کا سودا کر لیا تھا۔ لوگ اسے گھاٹے کا سودا جانتے مگر ہم پھر بھی جیت جاتے۔ جیت ایک پل کی بھی ہوتی ہے اور برسوں کی بھی۔ کہیں جیتنے والا ہی مات دیتا ہے۔

میں زندگی کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتی آئی ہوں۔ فتح و شکست کو یکساں قبول کرتی آئی ہوں۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میں بھی کسی قبر میں دفن ہوتی۔ دفن تو میں آج بھی کسی زندہ قبر میں ہوں۔ اس لیے کہ میں زود رنج جذبوں حساس ہوں۔ ہم تو وہ لوگ ہیں جنہیں پیدا ہوتے ہی دفنا دیا

جاتا ہے۔ جنازہ برسوں بعد بھی اٹھے تو کیا! کچھ جنازے پیدائش کے ساتھ ہی اٹھ جاتے ہیں اور کچھ بہت بعد میں مگر موت، کفن، جنازہ، قبر یہ سب رسمی واقعات ہیں کہ یوں بھی لوگ گہری نیند سو جاتے ہیں۔ ہم انہیں مٹی میں دفن کر دیتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں مجھے ابھی بھی وہ گیت یاد ہے۔ لگتا ہے جیسے یہ شاعرہ کی نہیں میری اپنی آواز ہو۔

دُعا

ہیلو ـــــ مینا ؟

جی

کمال ہے تم نے پہچانا نہیں ۔ میں تارا ہوں ۔

تارا ـــــ کیسی ہو تم ؟

خوش باش تم اپنی سُناؤ ۔

بس جی رہے ہیں ۔

اتنی مایوسی ـــــ اچھا کیا کرتی رہی ؟

یوں سمجھو کہ دن بھر کھیہہ کھاتی رہی ہوں ۔

حد ہو گئی نہ تم خود کبھی آتی ہو نہ کوئی اطلاع ۔

بس تارا ! کچھ مصروفیت ، کچھ سستی اور کچھ

بھئی کام تو سبھی کرتے ہیں مگر سب تمہارے جیسے نہیں ہوتے ۔

تارا ! اور لوگ تو کرتے ہیں افسری جب کہ ہم کرتے ہیں مزدوری ـــــ سناؤ کیا خبریں ہیں ؟

بس کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ میری شادی ہو رہی ہے ۔

اچھا — یہ عام خبر ہے ۔ ارے یہ تو شہ سُرخی ہے ۔ کب ہے شادی ؟

ابھی تو پورا مہینہ ہے ۔

بہت دُور ہے ۔ انتظار نہیں ہو رہا ۔

ارے مینا ۔ ساری عمر انتظار کرتی رہی ہوں ۔

وہ ہے کون ؟

نام ظفر ہے ۔ شادی کے بعد امریکہ چلی جاؤ گی ۔ کچھ منگوانا ہو تو بتاؤ ۔

نہیں بس تم خوش رہو ۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے ۔ میں تو ملنگ ہوں ۔

ہاں ملنگنی جی مزید سُنو ! موصوف کی ایک بہن اور تین بھائی ہیں ۔ سب شادی شدہ ہیں ۔

اگر تم چاہو تو تمہارے لیے انکار کر سکتی ہوں ۔

جی نہیں شکریہ ۔

اچھا تم کب آ رہی ہو ؟

دیکھو ۔

تمہارے اس دیکھو کو دیکھتے دیکھتے چھ ماہ ہو گئے تمہاری صورت نہ دیکھے ہوئے ۔ اُس تصویری نمائش میں بھی تم اچانک نظر آ گئی تھیں ورنہ ۔ مینوسن وہ جس آرٹسٹ کی نمائش تھی ناں وہ تمہارا پوچھ رہا تھا ۔

میرا ۔ کیوں ؟ کہاں ملا تھا ؟

وہ بھیا کے ساتھ آیا تھا بلکہ لایا گیا تھا ۔ میری تصویر بنا رہا ہے ۔

واہ PORTRAIT OF A LADY میں نے تو اُس فنکار سے انٹرویو کا وعدہ کیا تھا بس بھول گئی ۔ اپنے کاموں میں اُلجھی رہی ۔

ارے مینا تم صحافیوں نے کبھی اپنے ساتھ بھی کوئی وعدہ پورا کیا ہے ۔

تارا ! اور تھوڑے لوگ ہیں بدنام کرنے والے ۔ تم تو رحم کرو ۔

کبھی خود بھی رحم کرو ۔ بس کل تم آ رہی ہو ۔

نہیں سُنو کل تو مجھے اُس فلمسٹار کا انٹرویو کرنا ہے ۔

تمہیں وہ کبھی بھی چانس نہیں دلوائے گا ۔ اُسے چھوڑو ۔ میرے پاس چلی آؤ ۔

بھئی میں فلم میں کہاں کام کرنے جا رہی ہوں جو تم یہ سب کچھ کہہ رہی ہو ۔

اور وہ جو تمہاری پرانی خواہش تھی وہ —— ؟

ہاں ـــــ وہ ـــ وہ تو میں خود فلم بناؤں گی ۔ ایک نئی تجرباتی فلم ۔
ناممکن ـــــ تمہیں کبھی وقت نہیں ملے گا ۔ اچھا اب نہ میں کچھ سنوں گی نہ کہوں گی ۔
بس کل صبح تم آرہی ہو ۔
اچھا ٹھیک ہے ۔ خدا حافظ
ہاں مینا سُن ـــــ کل آتے ہوئے کوئی ایمبرائیڈری کے ڈیزائن والی کتاب لیتی آنا ۔
تارا ! بھلا میرا کڑھائی سلائی سے کیا رشتہ ؟
بھئی تمہارے پاس دس ہزار کتابیں رسالے آتے ہیں ان میں سے ڈھونڈ کر لیتی آنا ۔
اچھا دیکھوں گی ۔
اور اگر کل تم نہ آئی تو پھر میں دکھاؤں گی ۔ پہنچ جاؤں گی ۔ تمہارے اُس پھٹیچر سے دفتر میں ۔
کسی کرسی کی ٹانگ غائب ہے ، کسی کا بازو اور فائلوں کے رسالے کے ڈھیر ، بائیکل ردی کی دکان
ایسا دفتر ہوتا ہے بھلا ؟
بھئی اخباروں ، رسالوں کے دفتر ایسے بھی ہوتے ہیں ۔
ہاں ایسے ہی ہوتے ہیں ۔
اچھا سارا دن تم نے کہیں اور نہیں جانا بس میرے ساتھ ہی رہنا ۔
ہاں دفتر والے تو جیسے کام نہ کرنے کی تنخواہ دیتے ہیں ۔
مینا سُن کیا واقعی تنخواہ دیتے ہیں ۔
بس اب بات ختم امّی آواز دے رہی ہیں ۔ خدا حافظ
دن گزرتے پتہ نہیں چلتا ـــــ وقت کا کام گزرنا ہے سو گزر جاتا ہے ۔ تارا کی شادی بھی
ہو گئی اور وہ پردیس چلی گئی ۔ ایک مدت تک اُس کی کوئی اطلاع نہیں آئی ۔ پھر ایک دن اُسکا
خط آیا ۔
مینا !
مینا دُعا کرو میں وطن واپس آسکوں ۔ ورنہ میں مرجاؤں گی ۔ مرجاؤں گی ۔ میرے خُدا !
مجھے بچالے ۔ مالک میری مدد کر ، میں جینا چاہتی ۔ تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں ۔ بہت سی باتیں کرنا
چاہتی ہوں ۔ وہ تمام باتیں جو تنہائی میں اپنی جان جھیلتی رہی ہوں ۔
میں جینا چاہتی ہوں ـــــ اگر زندگی رہی تو ـــــ
تمہاری تارا

مینا کیسی ہو؟

اپنا حال تو تمہیں اگر بتاؤں گی۔ یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ تو بنا رہی ہوں۔ اگر کامیاب ہو گئی تو۔۔۔۔ دراصل مینا خواب جھوٹے ہوتے ہیں۔ حقیقت کتنی مختلف ہے۔ میں نے اب زندگی کو دیکھا ہے تو خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ مجھے وقت نے کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ تم پہچان نہ سکو گی۔

میں نے گھر والوں کی مرضی سے شادی کی مگر۔۔۔۔۔ مینا کوئی مرد اپنی بیوی کو دوسروں کی بیوی بننے پہ مجبور کرے تو کیا ذرا سی بات ہے۔ درگزر کرنے والی بات ہے۔ میں ان باتوں پر کیسے سمجھوتہ کر سکتی ہوں۔ جب ڈور دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو ناچنا ہی پڑتا ہے مگر کب تک؟ ڈور ایک سے دوسرے دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں جاتی رہے تو۔۔؟

تم میرے گھر والوں سے ابھی کچھ مت کہنا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

تارا کے اس خط نے مجھے بہت پریشان کیا۔ میں اُس کی واپسی اور زندگی کی دُعا مانگتی رہی۔ وہی تو تھی جس سے میں بات کرتی تھی ورنہ تو خاموش رہتی۔

تارا سے میری پہلی ملاقات کالج کے دنوں میں ہوئی تھی۔ میں نے بہت کم دوست بنائی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے دوست بنتی ہی نہیں۔ بن بھی جائیں تو ہمیشہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ وہ مجھ سے دُور ہو جاتی ہیں میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا کہ جنہوں نے مجھے چاہا، اپنایا وہ میری خواہش اور محبت کو نفرت یا غلط فہمی کے اندھے کنوئیں میں دھکا دے کر گزرتے رہے۔ ایک ایک کر کے کتنے ساتھی دوست بچھڑتے گئے۔ میں تنہا ہوتی گئی۔ پھر کوئی ہاتھ بڑھتا میں اُسے تھام لیتی مگر جلد ہی بے سہارا ہو کر گر پڑتی اور جان جاتی ہے کہ یہ بھی وہم تھا۔ خواب تھا۔ سراب تھا۔

تارا کی محبت اور دوستی سے بھی میں خوفزدہ تھی۔ ہر پل جُدائی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ فاصلوں کی گھنٹی جیسے کہیں دُور سے پکارتی۔ میری آنکھیں اُداسی اور دکھ سے بھری رہتیں مگر میرے لب خاموش ہی رہتے۔ ان کی خاموشی سے تارا نے دوستی کی اور پھر باتوں کی چابی سے یہ تالا توڑ دیا۔

تارا جس نے کئی زنگ آلود قفل اپنی دوستی اور خلوص کی کنجی سے کھول دیئے تھے۔ جانے اسمیں کیا جادو تھا کہ اُس نے میری ادھوری ملاقاتوں کو بھی طویل اور مکمل ملاقاتوں میں تبدیل کر دیا۔ میں اس کی رفاقت میں شبے اور خوف کے سارے آنسو آنکھوں سے گرا کر بیٹھتی تھی، یوں سُکھی رہتی جیسے زندگی

کا یہی ایک رنگ ہے۔ باقی رنگ نہ تو میں نے دیکھے تھے اور نہ ہی ان لمحوں میں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں تارا کی دوستی میں اُس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔

تارا دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اُس کے بھائیوں کا بیرون ممالک میں کاروبار تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر گھر سے باہر رہتے اور تارا تنہائی کا شکار رہتی۔ ماں باپ اور تارا میں ایک فاصلہ رہتا۔ جسے نہ وہ طے کر سکتی تھی اور نہ ہی والدین اس فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کرتے، بس ان کے بیچ کی دیواریں اتنی مضبوط اتنی موٹی تھیں کہ جذبوں کی پہنچ بھی نہ ہو سکتی اور نہ ہی ایک دوسرے کی آواز سُنائی دیتی۔ تارا اگر رات بھر دیواروں کو چاٹتی بھی رہتی تب بھی صبح دیوار اتنی موٹی ہوتی اُس نے اپنی تنہائیوں کا گواہ کسی کو نہیں بنایا تھا۔ اس کے کمرے کی تو ایک ایک چیز اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ وہ وقت کے چرخے پہ دُکھ اور تنہائی کو کاتتی رہتی ہے۔ یہ کیسا ترنم ہے جس میں ہر چرخے پہ وہی ایک لڑکی نظر آتی ہے جس کے ہاتھ میں آنسوؤں کی اکہری تار ہوتی جس کی تند بار بار ٹوٹ جایا کرتی اور وہ بار بار جوڑتی۔

تارا کے من کی باتیں صرف میں جانتی ہوں یا پھر وہ خود۔ مجھے علم تھا کہ تارا کیا سوچتی ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ وہ میری طرح اندھی خواہش اور خوابوں کو آنکھوں میں بسائے بیٹھی ہے۔ وہ اُس زندگی کو جینا چاہتی ہے جس میں اُس کے خواب اُس کی سوچیں اور اس کی ذات سبھی کچھ ویسا ہو جیسا وہ چاہتی ہے۔ وہ نہیں جو دوسرے چاہتے ہیں مگر جب اپنی مرضی کا جیون جینے کے لیے بھی دوسروں سے اجازت کی بھیک مانگنا پڑے تب؟

تارا نے بھیک نہیں مانگی تھی بلکہ زندہ رہنے کی خواہش کا اعتراف کیا تھا۔ یہ اعتراف اُسے کتنا مہنگا پڑا تھا۔ اب وہ زندگی کی بازی ہار چکی تھی اور موت اُس کے سانس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کاش یہ دروازہ نہ کھلے۔ موت نامُراد ہی واپس لوٹ جائے اور تارا بچ جائے۔ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کی آواز سُن کر جواب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ یہ کیسی معذوری، کیسی مجبوری تھی۔ آخر کیوں عورت اتنی محتاج ہوتی ہے۔

تارا کے خط کے بعد میں اُس کے دوسرے خط کی منتظر رہی۔ دوسرے خط کا کم اور تارا کا انتظار تھا کہ وہ آئے۔ مجھے علم ہو وہ کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟ میں اُس کے دُکھ درد کی تمام کیفیتیں سارے راز جاننا چاہتی تھی۔ اخباروں کی خبریں جمع کرتے کرتے افسانے لکھتے لکھتے ہمیشہ ہی ایسی باتوں کی تلاش رہی ـــــ کوئی نئی کہانی، کوئی نئی بات۔ شاید میں تارا پہ افسانہ لکھنے کا سوچ رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ میری کمینگی تھی یا کوئی بات۔ ممکن ہے میں اُس پر افسانہ لکھ کر چار پیسے کمانے

کے خواب دیکھ رہی تھی ۔ ؟

تارا کے گھر والے اُس کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے ۔ اُن کا خیال تھا کہ ڈاک کا نظام بہتر نہ ہونے کے باعث اُسکا کوئی خط اُن تک نہیں پہنچا ۔

پھر سُنا کہ اس نے گھر بدل لیا ہے اور نئے پتے کے بارے میں علم نہیں ہے ۔ گھر بدلنے کی خبر بھی تب ملی جب تارا کے بھائی اُس سے ملنے گئے ۔ اُس مکان میں اب کوئی اور مقیم تھا ۔ انہیں تارا کے بارے میں علم نہیں تھا کہ وہ اب کہاں ہوں گے ۔ کبھی کبھی تارا کا شوہر ظفر چکر لگا لیتا ہے ۔ اگر کوئی خط یا پیغام ہو تو وصول کر لیتا ہے ۔

مگر کیا تارا کے نام آئے خطوط اُس تک بھی پہنچتے ہوں گے ؟ اس کا جواب شاید کسی کے بھی پاس نہیں تھا ۔ کیونکہ ہم اُس منظر میں کہیں موجود نہیں تھے ۔ ہم وہاں کے حالات اور واقعات سے بے خبر تھے ۔

تارا کے گھر والوں کا خیال تھا کہ خوش ہو گی اس لیے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا ۔ مگر میں جانتی تھی ۔ کہ تارا کتنی اذیت سے گزر رہی ہو گی ۔ مجھے اُس دن سے ڈر لگتا تھا ۔ جب وہ خود اُن کی جھولی میں دُکھ ڈالنے آجائے گی تب کیا ہو گا ؟ کیا تارا سب کچھ کہہ سکے گی ؟

کہیں تارا کے والدین دوسرے لوگوں کی طرح اُس کو مجرم نہ سمجھیں ۔ یہ نہ کہیں کہ بیٹیاں تو والدین کے لیے سولی پر بھی چڑھ جاتی ہیں اور ساری عُمر قتل ہوتی رہتی ہیں ۔ لمحہ لمحہ قتل ہوتی رہتی ہیں ۔ تم کیسی بیٹی ہو ؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ تارا کو گھر والے قبول نہ کریں ۔ ؟

تارا تم کب آؤ گی ؟ انتظار کب ختم ہو گا ؟ سوچ کی سیڑھی کب ختم ہو گی ۔ اُلجھنیں ، خوف ، خدشے ، وسوسے میں اِن میں گھُٹ کے رہ گئی ہوں ۔ آؤ ! مجھے نجات دلاؤ ۔ آؤ تارا میں تمہارے ماتھے پہ ایسے اپنا ہاتھ رکھ دوں کہ کوئی تمہارے داغ نہ دیکھ سکے ۔ تمہاری خاموشی کو آواز دے دوں ۔ تارا ایک مرتبہ تم آؤ تو سہی ۔

ہم نے وعدہ کیا تھا ناں اگر موت نے ہمیں آنے کی اطلاع دی تو ہم ایک دوسرے سے آخری ملاقات ضرور کریں گے ۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو ۔ اگر ایسا ہوا تو ـــــ آہ ! میں تمہیں کیسے موت کے سپرد کروں گی ـــــ کیا واقعی ایسا ہو گا ـــــ نہیں ۔ نہیں تارا وہ تو سب کی سُنتا ہے وہ غفور الرحیم ہے ، وہ رب کریم ہے ۔ سب کے دلوں کے بھید جانتا ہے ۔ سب

کی مشکلیں حل کرتا ہے ۔

مالک ! میری مشکلیں آسان کر ۔ تارا کے دُکھ دُور کر دے ۔ اُس کو زندگی بخش ، اُس کے گناہ معاف فرما ۔ خطائیں درگذر فرما ۔ ہم بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دِکھا ۔ تو مشکل کُشا ہے ۔ میری دُعا قبول فرما مالک ! میری دُعا قبول فرما ۔ ہم تیرے عاجز بندے تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں تیری رحمت کے طلبگار ہیں ۔ ہماری دُعائیں قبول فرما ۔ ہمیں نیکی کی توفیق عطا فرما ۔ بدی سے بچائے رکھنا ۔ ہمیں دین و دُنیا میں سرخرو فرما ۔ کُل عالم کو ۔ جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشن راہ پہ لا ۔ ہماری مغفرت فرما ۔ ہماری دعائیں قبول فرما مالک ! ہماری دعائیں قبول فرما ۔

سر بسجود ، نم آنکھیں ، پھیلے ہاتھ ، آنسو ، آنسو ، خاموشی ، خاموشی ، بے ہوشی ۔

سوال

مینا ! تم مجھ سے شادی کرنے پہ رضامند کیوں نہیں ہوتیں ؟

جسطرح کی شادی تم کرنے کو کہتے ہو ایسی شادی کے لیے میں کبھی راضی نہیں ہوں گی ۔

کیا تمہارے والدین کا فیصلہ درست ہوگا ؟

ہاں کیوں کہ والدین اولاد کا بُرا نہیں چاہتے ۔

بُرا نہیں چاہتے —— مگر بُرا ہو جاتا ہے ۔ کیوں ؟

بس قسمت ——

کیا قسمت کو الزام دے کر خود کو تسلی دی جا سکتی ہے ۔ قسمت میں لکھا تھا ۔ ماں باپ ہی تو لکھتے ہیں ۔ مگر اپنے جُرم کو مانتے نہیں ۔ مینا تم نہیں جانتی یہ کس قدر خود غرض لوگ ہوتے ہیں ۔ محنت ہم کرتے ہیں اور کریڈٹ انہیں ملتا ہے ۔ واہ یہ خوب ہے ۔ صرف کریڈٹ ہی نہیں بلکہ حصّہ بھی ان کا اصل مقصد تو اولاد سے رقم وصول کرنا ہے وہ بھی سود در سود ۔ لین دین کا سلسلہ ان رشتوں میں تو کم از کم نہیں ہونا چاہیے ۔ محبتوں کا ثبوت دینے کے لیے اگر تم انہیں اپنے لہو کی ایک ایک بوند بھی دو گے ناں تب بھی وہ خوش نہ ہوں گے ۔ کون کہتا ہے کہ والدین بے لوث وفا کرتے ہیں ۔ انہیں تو بس خالی چیک کیش کروانا ہوتا ہے ۔ ہر فیصلہ انہی کا ہوتا ہے ۔ زندگی سے موت تک ہر فیصلے پر

انہی کے دستخط ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ میں بیٹے کی بولی لگا کر رقم لی جاتی ہے۔

علی عورت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اُس سے تو پوچھا بھی نہیں جاتا کہ تم کیا چاہتی ہو؟ کیا سوچتی ہو؟

مینا یہ لوگ تو زندگی برباد کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا؟ خود فیصلہ کیا؟ شادی طے کی اور مجھے اطلاع دی کہ فلاں تاریخ کو تمہاری شادی ہے۔

میں نے شادی کے دن ہی اُس عورت کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

علی یہاں بیشتر عورتیں بھی شادی کے روز ہی پہلی مرتبہ مرد کو دیکھتی ہیں۔ ایسی کونسی نئی بات ہے!

علی تمہاری شادی کو کئی برس ہو گئے۔ کیسے گزارتے رہے؟

اگر اسے گزرنا کہتے ہیں تو گزارتا ہی رہا۔

تمہیں اپنی بیوی کی کونسی بات ناپسند ہے؟

دیکھو! مینا وہ عورت میرا مزاج سمجھ ہی نہیں سکتی چاہے دو تین اور زندگیاں بھی جی لے۔ وہ کہتی ہے کہ آپ بتادیں آپ کیا چاہتے ہیں۔ اب تم ہی کہو۔ مینا میں اُسے کیا کچھ سمجھاؤں۔ مرد ایسی عورت چاہتا ہے جو اُسکی پلک کی جنبش بھی سمجھ سکے جان سکے۔ مرد سکوں کھول کر رکھنا نہیں چاہتا۔ بات وہ جو کہنے سے پہلے ہی سمجھی جائے اور فوراً عمل ہو جائے۔ میں اُسے کیا کچھ سمجھاؤں؟ میرا کہا اُسے سمجھ نہیں آتا۔ میں تو پریشان ہوتا رہتا ہوں۔

تم اُسے تبدیل کیوں کرنا چاہتے ہو۔ جیسی وہ ہے ویسے ہی تم اُسے قبول کیوں نہیں کرتے۔ اگر وہ تمہیں قبول کرتی ہے، ہر صورت میں قبول کرتی ہے تو تم کیوں نہیں کر سکتے۔

علی اگر وہ تمہارے ذہن تک نہیں پہنچ سکتی تو تم زبردستی کیوں کرتے ہو؟ ابھی اُسے بہت سفر طے کرنا پڑے گا۔ تم راہنمائی کرو گے۔ تو سفر جلد طے ہو گا۔

میں اُس کی موجودگی میں خود کو اجنبی محسوس کرتا ہوں۔

مگر وہ کیوں؟

اس لیے کہ وہ گھر اُس کا لگتا ہے میرا نہیں۔ سب اُس کی حمایت کرتے ہیں۔

علی تم اتنے چھوٹے ذہن کے مالک ہو۔ میں نہیں جانتی تھی۔ کیا تم بھی ان لوگوں جیسے ہو؟

لوگ۔ لوگ۔ لوگ تمہارے یہ لوگ نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں تم ان زہریلے لوگوں کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتیں۔ جانے کیسے کیسے یہ رگوں سے لہو نچوڑ لیتے ہیں۔

اس صفائی اور احتیاط سے تمہیں دھوکہ دے جائیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے ۔ اس طرح اداکاری کریں گے کہ تمہارا سچ ان کے سامنے جھوٹ نظر آئے گا ۔ خدا نہ کرے کہ کبھی تم بھی ان لوگوں جیسی ہو جاؤ ۔ یا کبھی تمہیں بھی ان لوگوں کی ضرورت پیش آئے ۔ تب تمہیں علم ہو گا کہ بڑے بڑے دعوے کرنے والے تمہارے کام کے وقت پہ کس طرح نظریں چرالیں گے ، عذر تراش لیں گے ، مصروفیات بڑھالیں گے اور تم دیکھنا تب بھی یہ کہیں گے کہ آپ کو کوئی کام ہو تو حکم دیجئے گا ۔ بس اب معذرت قبول کریں مگر آئندہ ضرور خدمت کریں گے ۔ جب وہ آئندہ آئے گی تب یا تو وہ تمہیں پہچان نہیں سکیں گے ۔ اگر پہچان لیا تو مصروفیت آڑے آجائے گی اور اچانک کوئی میٹنگ کوئی اپاؤنٹمنٹ یاد آجائے گی ۔ بہانہ ایسے بناتے ہیں کہ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتے ۔ جانے کب تم کام آجاؤ ۔ میں نے کہا ناں کے لوگ بڑے فنکار ہوتے ہیں ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کب ان کے اندر ڈرامہ چل رہا ہے ۔ ہر وقت لوگ ڈرامہ کرتے رہتے ہیں ۔ بہت بڑے بڑے ڈرامے ، اصل زندگی کے ڈرامے جس کا سکرپٹ بھی وہ خود لکھتے ہیں ۔ ہدایات بھی وہ خود دیتے ہیں اور پیشکش بھی انہی کی ہوتی ہے ۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے ——— ۔ مینا تم نہیں سمجھو گی نہیں جانو گی ۔

علی تمہیں کیا پتہ کہ میں نے تجربے کا کتنا زہر پیا ہے ۔ میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ تم کب کب ڈرامہ کرتے ہو ۔ کس طرح میرے سامنے چہرے بدلتے ہو اور کس خوبی سے چہرے چھپاتے ہو ——— میں تو بہت کچھ جانتی ہوں ۔

ہاں اگر نہیں جانتی تو اتنا نہیں جانتی کہ کس خطا کی سزا بھگت رہی ہوں اور میری سزا کب ختم ہو گی ۔ ہو گی بھی یا نہیں ۔ اگر ہو گی تو کب اور اگر نہیں تو پھر کیوں نہیں ؟ بس عمر بھر ہم کب ، کیوں ، ہاں نہیں شاید ، اگر ، مگر انہی لفظوں کے گرد گھومتے رہتے ہیں ۔ انہی لفظوں کے ساتھ جیتے رہتے ہیں ۔ عمر بھر ہونے اور نہ ہونے کے فیصلے میں اُلجھے رہتے ہیں ۔ اپنا آپ ختم کر ڈالتے ہیں ۔ شاید ہم ختم ہونے کے لیے ہی کچھ دیر زندہ رہتے ہیں ۔ اگر اس زندہ رہنے کو زندہ رہنا کہا جاتا ہے تو ——— اگر نہیں تو ہم بے بس و مجبور ہیں ۔ ہمارا اپنے آپ پر بھی اختیار نہیں ۔ سوچ اور جذبے بھی ہمارے تابع نہیں ہمارے ہی وجود کے حصے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیتے ہیں ہم خاموش رہتے ہیں ۔ ہم خاموش رہتے چلے آتے ہیں اور خاموش ہی گزر جاتے ہیں ۔ یہ کتنی مجبور زندگی ہے ۔ ہم تو سچ بھی نہیں بول سکتے کہ ہمیں اجازت نہیں ۔ ہمیں اپنی مرضی کی اجازت کے لیے بھی اجازت کی ضرورت رہتی ہے ۔ یہ ضرورتیں اور اجازتیں کیوں ہوتی ہیں ؟ حیرت سے میرا چہرہ مت دیکھو ۔ جواب دو ناں ۔ کوئی ایسا

جواب جو مجھے تسلی دے سکے ۔ کیا کوئی بھی ایسا جواب نہیں ہے ۔ صرف سوال ہیں ، خوفناک سوال ، اندھے سوال ، گونگے ، بہرے سوال ، سوال ۔ ہزاروں لاکھوں سوال ۔ زندگی اور موت کے سوال ، خوشی اور غم کے سوال ، آنکھوں اور آہوں کے سوال ، دھڑکنوں اور دِلوں کے سوال ، جسموں اور ذہنوں کے سوال ، فاصلوں اور قربتوں کے سوال ، دُوریوں اور مجبوریوں کے سوال ، الجھنوں اور مسئلوں کے سوال ، موسموں اور مزاجوں کے سوال ، دولت اور غربت کے سوال ، بھوک اور بیرُوزگاری کے سوال ، بھیک اور ضرورتوں کے سوال ، خواہش اور ضرورت کے سوال ، روح کی پاتال سے نکلنے والے سوال ، تنہائی اور خوف کے سوال ، صبر اور جبر کے سوال ، اولاد اور والدین کے سوال ، وقت اور حالات کے سوال ، سوالوں کے انتظار میں کئے جانے والے سوال ، جواب کی غیر موجودگی سے گھبرا جانے والے سوال ، سوالوں کو جنم دینے والے سوال ، سوالوں کی تمنا کرنے والے سوال ، ہماری زندگی کیا ہے ؟ صرف ایک سوالیہ نشان ۔ یہ نشان کب مٹے گا ؟ یہ نشان جانے کس سوال سے شروع ہوا اور کس سوال پر ختم ہوگا ۔ پہلی مرتبہ اس نشان کو بناتے ہوئے ہاتھ کانپے ہوں گے ؟ انگلیوں نے انکار کیا ہوگا ؟ اس نشان کو دیکھنے والے سہمے بھی ہوں گے ؟ انہوں نے اس نشان کی مجبوری کو جانا ہوگا ۔ اس کی زندگی کو قبول کیا ہوگا ؟ اس کے وجود کو تسلیم کیا ہوگا ؟ یا ——— ؟ اسی یا کے دوسری طرف کوئی راستہ نہیں جاتا اور بہت سے راستے جاتے ہیں جو کبھی نا اُمیدی اور کبھی اُمید کے چوراہے پہ جا نکلتے ہیں ۔ پتہ نہیں یہ راستہ کدھر جائے گا ؟ کہیں رُک تو نہیں جائے گا ؟

میں نے دیکھا کہ علی خاموش ہو گیا تھا اور اُس کا چہرہ ۔ محض ایک سوالیہ نشان ؟ بن کے رہ گیا تھا ۔ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس سوال کے ختم ہو جانے پر اگلی سطر میں جواب لکھا جائے گا یا ایک لکیر کھینچ دی جائے گی ۔ تب مجھے اپنا آپ بھی ایک سوالیہ نشان جیسا لگا ۔ جس کا جواب کہیں تھا یا نہیں ۔ میں کچھ نہیں جانتی تھی ۔ کچھ بھی نہیں یہ سوائے اس کے کہ سوال میرے اور علی کے گرد شور مچا رہے ہیں ۔ وہ خاموش کیوں نہیں ہوتے ؟ ہم دونوں شاید ایک ہی بات سوچ رہے تھے یا پھر مختلف باتیں سوچ رہے تھے ؟

سفر

ہر صبح مجھ سے سوال کئے جاتے اور ہر روز میں مسکرا کر خاموش جواب دے دیتی مگر سوال وہیں کے وہیں رہتے۔

میں کیوں لکھتی رہتی ہوں؟ اس نوعیت کے سوالوں کا کوئی ایک جواب نہیں ہوتا بلکہ بہت سے جوابات ہوتے ہیں۔ شہرت کے پس منظر میں کون جھانکتا ہے؟ لکھنا میری مجبوری اور ضرورت تھی نہ لکھتی تو کیا کرتی؟ میرے نزدیک یہی رہنے والی چیز تھی، جبھی میں نے اس کی طرف مکمل توجہ دی۔ لکھنے کو تو ہر شخص لکھ سکتا ہے مگر اس لکھنے میں پڑھنے والی بات کسی کسی جگہ ہوتی ہے۔ ہر لکھنے والا اس جگہ کے متعلق نہیں جانتا بلکہ بعض اوقات پڑھنے والے بھی علم نہیں رکھتے۔ ہر ادیب شاعر اور صحافی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اچھا قاری بھی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اچھا لکھنے والا نہیں ہو سکتا۔

محض بہت سے لفظ اکٹھے کر دینے سے ہی کوئی بھی تحریر اچھی نہیں بن جاتی ان لفظوں کے اندر گہرائی اور معنی پوری دیانتداری اور سچائی سے موجود ہونا ضروری ہے۔ میں اگر صحافی یا ادیب نہ ہوتی تو ممکن ہے کچھ بھی نہ ہوتی۔ ہو سکتا ہے میں گلوکار ہوتی، آرٹسٹ ہوتی ہے۔ کچھ بھی ہو سکتی تھی مگر جو بھی ہوتی دوسروں کو سکھ ہی دیتی۔ دوسروں کی مشکلیں حل کرتی۔ میرا اہم مقصد یہ ہے کہ میں کسی کو دکھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ دوسروں کو دکھ نہ دینے کا مطلب ہے کہ آپ کی اپنی جھولی کانٹوں سے بھری رہے ——

میں پرانے زمانے کی روح ہوں ۔ اسی لیے آج بھی ادب میں زندگی اور ادب دیکھنے کی خواہاں ہوں ۔ جب منافقت اور کذب کی آمیزش نہیں تھی مگر آج تو ادب میں بے ادب لوگوں کی اکثریت ہے ۔ میں نے ٹی ہاؤس اور اسی قسم کے دوسرے حلقوں میں بیٹھنے والے ادیب شاعروں کو بغور دیکھا ہے اور جانتی ہوں کہ یہ لوگ ان میں سے بیشتر لوگ بہت جھوٹے اور چھوٹے ہیں ۔ یہ لکھے پڑھے اور باشعور جتنے ۔ بے ضرر نظر آتے ہیں اتنے ہی ضرر رساں ہوتے ہیں ۔ ان کے ذہن اور خیالات پریشان اور منفی ہوتے ہیں ۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ لفظ لکھنے اور کہنے والے چونکہ لفظوں کے اسرار و رموز سے واقف ہوتے ہیں اس لیئے اِن کا غلط استعمال بآسانی کر سکتے ہیں ۔ بڑے بڑے خوبصورت لفظوں کے جال بُنتے ہیں اور ان میں نوآموز لکھاریوں کو قید کرتے ہیں ۔ عورتوں کو نام کا لالچ دے کر اپنے لفظ بیچ کر انہیں خرید لیتے ہیں اور اعتراف نہیں کرتے ۔ چونکہ یہ لوگ سچائی اور حقیقت پسندی کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں اس لیے ان کے جھوٹ پوشیدہ رہتے ہیں ۔ بڑے بڑے ناموں اور خوبصورت چہروں کے پاس بہت سے نوآموز لکھاریوں کا جھرمٹ ہوتا ہے جو انہیں ان کی حیثیت سے بلند اور نہایت ارفع و اعلیٰ شخصیت کے روپ میں پیش کرتا ہے ۔ ان کے دفاع کے لیے نہایت موزوں الفاظ منتخب کئے جاتے ہیں ۔ ان کو دانا اور پُراسرار بنانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے ۔ ادب نوازی کے شوق میں لوگ کوئی بھی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں ۔ حقیقتاً اس جھرمٹ میں کئی ادب نواز اور ادب شناس بھی ہوتے ہیں مگر ان کا علم بہت بعد میں ہوتا ہے ۔ چائے اور سگریٹ کے ساتھ ساتھ گھنٹوں کی بے معنی گفتگو بھی ان لوگوں کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہے ۔

میں نے ہر لکھنے والے کا احترام کرنا سیکھا ہے مگر اس نوعیت کے غیر ادیب غیر شاعر لوگوں کو دیکھ کر میں حیران اور رنجیدہ ہوتی ہوں ۔ میں بہت سے ایسے چہروں سے بھی واقف ہوں جو لوگوں کی نظر میں محترم ہیں درحقیقت انہیں لفظ چھو کر نہیں گزرے ۔

میں نے وقت سے بہت پہلے جان لیا تھا کہ یہ حلقے سیاست کے سوا کچھ نہیں دے سکتے ۔ وہ تحریر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور تنقید کئے چلے جاتے ہیں ۔ اُن کی بحث تحریر پر نہیں بلکہ شخصیت پر ہوتی ہے ۔ اگر کوئی کسی حلقے سے متعلق تو نہیں تو اسے ضرور کسی حلقے میں شامل کرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

میں کم علم اور جاہل انسانوں کی محفلوں سے گریز کرتی ہوں ۔ میں ان لوگوں کی تنقید اور تعریف سے دُور بہت دُور تنہا اپنے خیالات کاغذ کی دھرتی پر اتارتی رہتی ہوں جانتی ہوں کہ آج نہیں تو کل میں سرخرو

ہوں گی ۔ جنہیں میرے ساتھ چلنا ہے وہ ہر صورت چلیں گے ۔ پیچھے رہ جانے والے ہم سفر نہیں ہو سکتے ۔ جسطرح آگے چلنے والوں کو میری ضرورت نہیں ۔ سفر اور منزلیں جُدا جُدا بھی تو ہوتی ہیں ۔ میں اپنا سفر آہستگی سے مستقل مزاجی سے طے کر رہی ہوں ۔ میں تو سفر بھی عبادت کی طرح کرتی ہوں ۔ جیسے میں اپنی تخلیق کو عبادت کے مقام پر دیکھتی ہوں ۔ میری تخلیق اور عبادت دونوں بیک وقت خُدا سے ہم کلام ہوتے ہیں ۔ منزل کی خواہش اور جستجو ہے مگر لگن اور مستقل مزاجی منزل پر پہنچنے کی پہلی شرط ہے ۔ مجھے علم ہے کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ میری ریاضت اور عبادت اگر برسوں کی ہے تو گیان کی راحت بھی مجھی کو ملے گی ۔

جب علم کا نور میرے سینے میں اتارا گیا تو اس نور کی کرنیں دوسرے انسانوں کو بھی اُجلا بنائیں گی ۔ مجھے ان چہروں میں اپنا عکس نظر آتا ہے ۔ تو خوشی خوشبو بن کر میرے بدن سے پھوٹتی ہے لوگ اس مہک کے اسیر ہو جاتے ہیں اور مجھ سے رہائی ممکن نہیں ۔ وہ مجھے جھٹلا نہیں سکتے ۔ مسرت اور دُکھ کی دوہری کیفیت کا شکار ہو جاتی ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا نہیں سکتے پھر زندگی کے الاؤ میں سسکیاں بھر جاتی ہیں ۔ صدا اور شعلے بکھر جاتے ہیں ۔ لوگ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگتے ہیں ۔ یہاں تک کہ ان کے حلق چیخ اُگل دیتے ہیں ۔ زندگی اور موت کے دوراہے پہ کھڑی چیخ میری سماعت میں رس گھولتی ہے ۔ میں جھوم اُٹھتی ہوں ۔ دیوانہ وار رقص کرتی ہوں ۔ اعضاء کا رقص روح میں شامل ہو جاتا ہے ۔ شور، شور ــــ میں تھک کر ڈھے جاتی ہوں ۔ پردہ گر جاتا ہے ۔ اندھیرا ــــ آوازں کے ہجوم میں کھو جاتا ہے ۔ آوازیں ــــ اندھیرا ــــ خاموشی ــــ ۔

منظر بدل جاتا ہے ۔ زرد چہرے آنکھوں میں وحشت اور رتجگے لیے میرے گرد گھوم رہے ہیں ۔ میں اپنی ذات میں قید ہو گئی ہوں ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا ــــ نہ لوگ ــــ نہ آوازیں ــــ نہ اندھیرا ــــ بس میں ہوں ــــ میرے ہزار رنگ ــــ میری باتیں ــــ میری آوازیں ــــ میرے چہرے ــــ میری سوچیں ــــ وحشتیں ــــ تنہائی ــــ تنہائی !

فاصلہ

مینا ! تم اتنی سمجھدار کیوں ہو ؟ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ میں طویل گفتگو کروں مگر تم ادھورا جملہ سُن کر بھی بات جان لیتی ہو اور کبھی کبھی بنا کہے سمجھ لیتی ہو ۔

علی یہی تو سیکھا ہے وقت سے ، ویسے پتہ ہے میں سوچتی ہوں کہ ساری دُنیا مل کر عورت اور مرد دونوں کو قتل کرنے میں مصروف ہے ۔ دونوں اپنی اپنی جگہ دوسروں کے لیے جیتے ہیں ۔ اپنے لیے تو کچھ پل کی زندگی ملتی ہے ۔ ساری عمر تو رشتوں ناتوں کے نام پر ختم ہو جاتی ہے اپنے لیے زندہ رہنے کی اجازت ہی نہیں ملتی ۔ زندگی ایسی کیوں ہے ؟ جب اپنی زندگی ملتی ہے تب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے ۔ تمہارے متعلق سوچتی ہوں تو جانے کہاں سے تمہارے اپنے اور جانے کس کس کے گھر والوں کی الجھنیں گھیرنے لگتی ہیں ۔ ان سے بھاگتی ہوں ۔ تو مصروف زندگی میرے انتظار میں رہتی ہے ۔ اِس دُنیا سے بھاگ کر بمشکل تمام خود تک پہنچتی ہوں ۔ راستے کی ساری گرد میرے دل پہ چھا جاتی ہے ۔ ساری تھکن آنکھوں میں بھر جاتی ہے ۔ تمہاری خاطر یا پھر اپنی خاطر جینے کی تمنا میں جانے کب سے کر رہی ہوں مگر کچھ لمحوں کے پیچھے برسوں سے بھاگتی چلی آ رہی ہوں ۔ لگتا ہے کسی دِن میرا اپنا چہرہ بھی کھو جائے گا ۔

مینا ! تم اتنی مایوسی اور دُکھ کی باتیں کیوں کرتی ہو ۔ میرے سارے خواب ڈھے جاتے ہیں ۔

ہاں ۔ تمہارے تو صرف خواب تھے ۔ اور میرا جانے کیا کچھ ڈھے گیا ـــــــ ۔ مگر تم کیا جانو ۔ اس

طرح ٹکڑوں میں بٹی زندگی گذارنا کتنا دشوار ہے ۔ میں تھک گئی ہوں اور جانتی ہوں کہ میرے سفر میں نشانِ منزل تو آئے گا ۔ منزل نہیں ۔

مینا تم کیا سمجھتی ہو کہ میں اپنی زندگی سے خوش ہوں مطمئن ہوں ۔

تم سُکھی ہو یا نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ اُس بے چاری بے قصور عورت پہ ظلم کرتے ہو ۔ اور اپنے سُکھ کی بات کرتے ہو ۔ نہیں کسی اور کا کوئی احساس نہیں ۔ کتنے خود غرض ہو تم اُسے کس بات کی سزا دے رہے ہو ؟

مینا تم اُس کے لیے کیوں پریشان ہو رہی ہو ؟ اسکے بارے میں تم سے میں کچھ سُننا نہیں چاہتا ۔

مجھے اس سے نفرت ہے ۔

علی تمہیں اُس سے نفرت ہے اور مجھ سے ——— ؟

تم سے مجھے شدید محبت ہے ؟

علی کیا تم ایک مدت سے ڈرامہ نہیں کر رہے ہو ——— ؟

نہیں مینا ! ہرگز نہیں یہ سچ ہے کہ میں نے تم میں وہ سب دیکھا ہے جو میں نے چاہا ۔ ہر مرد عورت میں ماں کی جھلک دیکھنا چاہتا ہے ۔

علی ماں کی محبت تو دریا کی مانند ہوتی ہے ۔ پھر بھی مرد اتنا پیاسا کیوں رہ جاتا ہے ؟

مرد کو صرف ماں کی ضرورت ہی نہیں بلکہ استانی کی بھی ہے ——— مرد چاہتا ہے کہ کوئی اُسے سنبھال کے رکھے ۔ کوئی اس کا بہت خیال رکھے ۔ کبھی پیار کرے کبھی ڈانٹے ۔ سکول جانے والی ہر اُستانی مجھے اپنی لگتی ہے ۔ راستے میں گزرتی ہوئی کسی اُستانی کو دیکھ کر میرے پاؤں رُک جاتے ہیں ۔ میری بیوی کو علم نہیں کہ وہ مجھ کو کیسے سکھ دے سکتی ہے ۔ مرد عورت کی ہر غلطی کو معاف کر سکتا ہے صرف اس لیے کہ اُس عورت نے اولاد کی صورت میں مرد کے وجود کا حصہ اُسے لوٹایا ہوتا ہے ۔

میں نے ساری عمر خشک آنکھوں سے روتے ہوئے گزار دی ۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ مرد ایک عورت میں ہزار روپ کی خواہش رکھتا ہے ۔ وہ بچپن سے سہاروں کا عادی بنایا جاتا ہے پھر وہ کیسے خواہش نہ کرے ۔

علی خواہش اور اُمید کا جنگل بہت گھنا اور طویل ہوتا ہے ۔ پاؤں تھک جاتے ہیں ۔ مگر راستہ ختم نہیں ہوتا ۔ خواہش کی زنجیر ٹوٹتی نہیں بلکہ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے ۔ سہاروں کی عادت بھی ہماری زندگی کا حصہ بن جاتی ہے نامحسوس طریقے سے ۔ بنا بتائے وہ ہم سے چھپ کر کہیں پڑاؤ ڈال دیتی ہے ۔

ہم عادت کے جنگل میں پھنس جاتے ہیں ۔ جسطرح تمہیں بھی کئی دوسرے انسانوں کی طرح میری عادت ہو گئی ہے ۔ تم اسے ترک نہیں کر سکتے مگر آہستہ آہستہ کم ضرور کر سکتے ہو ۔ پتہ نہیں میں انسانوں کی ضرورت کیوں بن جاتی ہوں ؟

مینا تم نے کیا اس عادت کو سگریٹ یا کافی سمجھ لیا ہے ۔

نہیں جانتی ہوں کہ بُری عادتیں سانسوں کے ساتھ ہی چھٹکارا پا سکتی ہیں ۔ کوشش کروں گی کہ تمام قرض چُکا سکوں ۔ چاہے خُدا سے کچھ سانس اُدھار کیوں نہ لینے پڑیں ۔ مگر میں تھک جاؤں گی مجھ پر تو کئی انسانوں کا قرض ہے ۔ جب ادا کرنا شروع کروں گی تو حساب بھی لے لوں گی ۔ پہلے محبت کے جرم کی ادائیگی کر لوں پھر کسی اور حساب کی بات کروں گی ۔ بہت سے جُرم ناقابلِ معافی بھی ہوتے ہیں ۔ کچھ لفظوں کو معافی کا احسان اور رحم نہیں دیا جا سکتا اور پھر انصاف کہاں ہے ؟ یہ سب بہلاوے تو انسان کو زندہ رکھنے کی سازش کا حصّہ ہیں ۔ ہم سچ کی تلاش میں کب تک بھٹکتے رہیں گے ؟ لیکن سچ ہے کہاں ؟ دلاسہ کب تک بیچیں گے ؟ اداکاری کب تک کریں گے ۔ ہم نے شعور کی دولت لے کر دراصل اذیت اور کرب حاصل کیا ہے ۔ اچھا ہوتا اگر برسوں پیچھے نادانی کی دُنیا میں واپس چلے جاتے ۔

مینا کبھی کبھی تم بچّی بن جاتی ہو ۔ ویسے اکثر تم اپنی عمر سے آگے کی باتیں کرتی ہو ۔

علی ہم وہ لوگ ہیں جو بچپن سے اچانک بڑھاپے کی دہلیز پہ کھڑے ہو گئے ہیں ۔ " جوانی " اجنبی لفظ لگتا ہے ۔ میں جوانی کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکی ۔ کیونکہ وقت اور حالات اس کی اجازت نہیں دیتے ۔ علی ! اُس جوانی کو جوانی کون کہے گا جو محنت کی بھٹی میں سلگتی رہے ۔ وہ جوانی جوانی نہیں کہلا سکتی جو دیوانی نہ ہوئی ہو ۔ اگر جوانی کے دن بنا آہٹ کئے میرے در سے چُپ چاپ لوٹ گئے تو میں قصوروار نہیں ۔ اس دور میں سب سے کٹ کر رہنے والے لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں ۔ مجھے بھی پیچھے رہنے کی لت پڑ گئی ہے ۔ میں لوگوں کے ہجوم میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں ۔ بہت پیچھے ـــــ میں تو چاہتوں سے گریزاں رہنے والی محبتوں سے خوفزدہ رہنے والی لڑکی ہوں ۔ مجھے شدّتوں سے ڈر لگتا ہے ۔ جانتے ہو میں کبھی اپنے کسی فیصلے پر پشیمان نہیں ہوتی ۔ جانتی ہوں کہ جس وقت جو فیصلہ جو عمل میں نے کیا ـــــ وہی اس لمحے کا سب سے بڑا سچ تھا ۔ میں نے اپنے جیسی خواہشوں کو اپنا کر کوئی جُرم نہیں کیا ۔ جن چیزوں پہ میرا نام لکھا ہونا چاہیے تھا ۔ اُن پہ میں نے اپنا نام لکھا ۔ چاہے اپنے لہو سے مگر لکھا ضرور ۔ مجھے لکھنا چاہیے تھا ۔ جن مقامات پر میں نے برسوں پہلے لکیر کھینچی تھی آج بھی اُسے عبور نہیں کیا ۔ فاصلہ رہنے دیا ۔ جس سے جو رشتہ قائم کیا وہ نبھایا ـــــ جن چیزوں سے نفرت کی ہمیشہ کی ـــــ کرتی رہوں گی ۔

میں چہروں سے محبت کرتی ہوں ۔ نام بھلائے جا سکتے ہیں ۔ مگر چہرے نہیں ـــــ ناموں سے چہروں کی شناخت ہوتی ہے روحوں کی نہیں ۔ اور روحوں کی شناخت ہر انسان نہیں کر سکتا ـــــ لوگ تو جسموں کے حوالے سے پہچانتے ہیں ـــــ عورت مرد کے لیے انا کا مسئلہ کیوں بن جاتی ہے ؟ جیت محض جسم کی جیت ہی کیوں اہم سمجھی جاتی ہے ۔ چاہت کے ساتھ ساتھ اس دُنیا میں رہنے والے سفر نہیں کرتے ۔ جدائیوں کے بیج بونے والوں کو خبر نہیں ہوتی کہ آنے والی فصل وصال کی ہوتی ۔ جسطرح وصل کی لذت سے سرشار انسان جُدائی کی آمد سے بے خبر ہوتا ہے ۔ خزاں اور انتظار کا موسم ہمیشہ رہتا ہے ۔ مگر کبھی وقت کی چال بدلتی ضرور ہے ۔ کسے خبر ہمارے ہاتھوں میں ہماری ہی لاشوں کے کتبے تحریر ہوں گے خوشبختی کی ریکھا ہوگی ۔ میں نے جذبوں سے محبت کی ہے ـــــ اور محبتوں کا احترام کیا ہے ۔

علی اور میری آنکھوں کے بیچ فاصلہ تھا مگر اتنا کہ ہم نے بند آنکھوں میں ایک ایک علیحدہ کمرہ بنا لیا تھا ۔ ہم اطلاع کے بغیر ایک دوسرے کے کمرے میں گھومتے رہتے ۔ کہ انتظار تو کھلے دروازوں سے جھانکتا ہے ۔ پھر ان پر قفل کون ڈالتا ؟

صدا

آگہی کے اس سفر نے مینا کو زندگی کی لمبی اور نہ ختم ہونے والی سڑک پہ چلنا تو سکھا دیا ہے مگر جان لیوا تنہائی کا درد اُس کی روح میں اتر گیا ہے۔

کیا مینا یونہی جلتی سُلگتی رہے گی؟

پل پل مرتی رہے گی؟

مینا کے زخمی پاؤں سے رِستے لہو کے قطرے خاموش چیخ کی صورت وقت سے سوال کرتے ہیں۔

وہ روح کی شناخت کیوں نہیں کر سکتے؟

کیا مینا کبھی اپنی مرضی کا جیون جی سکے گی؟

کیا کوئی بھی خوشی مینا کے لیے نہیں آسکتی؟

کیا کبھی مینا کو اپنی منزل مل سکے گی؟

کیا مینا ساری عمر آگ کے دریا سے گزرتی رہے گی؟

کیا مینا کی آنکھیں اُداسی اور غم سے یونہی بھری رہیں گی۔

کیا مینا کے ذہن تک کوئی بھی شخص نہیں پہنچ سکتا؟

کیا مینا کے خواب یونہی قتل ہوتے رہیں گے؟

کیا تلخ حقیقتیں ہمیشہ اُس کے تلوے چاٹتی رہیں گی ؟
کیا مینا ساری عمر بھٹکتی رہے گی ؟
کیا مینا کی زندگی ایسی رات ہے جو کبھی سورج کا چہرہ نہ دیکھ سکے گی ؟
کیا ہمیشہ گدھ نما انسان مینا کے گرد منڈلاتے رہیں گے ؟
کیا وہ دوسروں کے دُکھ اپنی جھولی میں ڈالتے ڈالتے خود بھی چھلنی ہو جائے گی ؟
کیا مینا کو خوفناک آنکھوں اور ظالم پنجوں کی وحشت مارتی رہے گی ؟
کیا اُس کی زندہ لاش یونہی وقت کے چوراہے پہ برہنہ پڑی رہے گی ؟
کیا مینا ہمیشہ زندگی اور موت کے دوراہے پہ خوفزدہ کھڑی رہے گی ؟

گلی سڑک

انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے نام

بنی آدم اعضائے یک پیکرند — کہ در آفرینش زیک گوہرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار — دگر عضو ہارا نماند قرار
تو کز محنّتِ دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

(سعدیؔ)

گیلی سڑک

دوراھا

قبرستان ۔ دُھواں ۔ موت کی خوشبو ۔ تاریکی ۔ سناٹا ۔ سکوت ۔ گہری خاموشی ۔ ہاں خاموشی ۔ جس کا راز کوئی نہ جان سکا ۔ نہ تم ۔ نہ میں ۔ نہ وہ ۔ نہ ہم ۔ اور ہم نے جو راز جانے وہ اتنے گہرے پُراسرار ۔ تنہا ، اتنے اُداس اتنے اہم تھے کہ ہم اُن کی اہمیت کو کہیں دُور بھول کر چھوڑ آئے ہیں ۔ ہم اہم اشیاء کو بھول جاتے ہیں اور غیر اہم اشیاء ہماری ضرورت بن جاتی ہیں ۔ ہم بھولنے اور چھوڑنے میں دیر نہیں کرتے بہت جلد بہت دُور چھوڑ دیتے ہیں ہاں شاید بہت زیادہ دور ـــــ بہت ہی دُور ـــــ ۔

کتنی دور ؟

اتنی دُور جہاں سے زندگی شروع ہوتی ہے اور اذیت سانس لیتی ہے ۔ اور لہو ، ہاں گرم گرم لہو بہتا ہی چلا جاتا ہے ۔ رنگ بدلتے چلے جاتے ہیں اور عورت کا رنگ ایک نئی تخلیق نئی تصویر کو زندگی دے کر خود بے رنگ ہو جاتا ہے ۔ شاید زرد رنگ نہیں سفید رنگ . . . . .

سفید رنگ ؟ مگر وہ تو کفن کا رنگ ہوتا ہے ۔ خون کے رشتوں کا رنگ . . . . .

ہاں اور آنسو کا بھی ـــــ آہوں کا بھی ـــــ درد کا بھی ـــــ اور ـــــ اور ؟ ـــــ اور بچے کا بھی !

کونسے بچے کا !

اُس بچے کا جس کو جنم دے کر ماں خود موت کے اسپتال چلی گئی۔

موت کے اسپتال؟ کیا موت کا بھی کوئی اسپتال ہے؟

ہاں قبرستان: پتہ ہے وہاں بھی کبھی ملاقاتی آتے ہیں۔

ملاقاتی؟

ہاں ملاقاتی۔ پھولوں کے گلدستے لے کر، پھیکی مسکراہٹ لے کر، گرم آنسو لے کر، سرد آہیں لے کر اور ہاں کبھی کبھی تو ڈاکٹر کا چہرہ بھی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر؟ کون؟ فرشتے؟

نہیں۔

خُدا ——؟

خُدا؟ لیکن وہ قبر میں کیسے آسکتا ہے؟

وہ تو ہر جگہ آسکتا ہے۔ پھر قبر میں کیسے نہیں آسکتا؟

یوں نہیں کہ قبر بہت گہری اور تاریک ہوتی ہے۔ پھر مٹی نے بھی تو ساری قبر کے دروازے، کھڑکیاں اور روزن سبھی کچھ تو بند کر دیا ہے۔ پھر وہ کیسے آسکتا ہے؟

ممکن ہے قبر میں موجود جسم، نہیں جسم اور روح نے کوشش کر کے کوئی خفیہ راستہ بنا لیا ہو۔

سُنو! کیا قبر میں رہنے والے کو ہوا اور پانی کی ضرورت نہیں ہوتی؟

نہیں کم از کم اتنی نہیں جتنی ان انسانوں کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

کن انسانوں کے لیے؟

جنہیں ہم دیکھتے رہتے ہیں۔ دن رات اپنے اردگرد گھومتے پھرتے ہوئے بولتے ہوئے۔

ہم کہاں دیکھتے ہیں؟

ہاں ہم دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔

بات تو قبر کی ہو رہی تھی یہ انسان کہاں سے درمیان میں آگئے۔

انسان اس لیے درمیان میں آگئے کہ قبریں انسانوں کی ہوتی ہیں۔

قبریں تو انسانوں کی بھی ہوتی ہیں اور چڑیوں کی بھی اور ——؟

تم نے کیا صرف چڑیوں کی قبریں دیکھی ہیں؟

ہاں دیکھی بھی ہیں۔ بنائی بھی ہیں۔ پتہ ہے میں نے ہزاروں مرتبہ یا پھر لاکھوں مرتبہ معلوم نہیں

کتنی مرتبہ قبریں بنائی ہیں۔ بہت سی قبریں ——

کیسے ؟ کیا تم نے اپنے ہاتھوں سے ڈھیروں قبریں بنائی ہیں ۔

ہاں اپنے ہاتھوں سے بہت سی قبریں بنائی ہیں ۔

کس کس کے لیے ؟

اپنے لیے اور کس کے لیے ؟

مگر تم تو زندہ ہو ۔ میرے پاس اس کمرے میں بیٹھی ہوئی ہو ۔ پھر قبریں کون ہے بلکہ اُن تمام قبروں میں کون ہے ؟

وہ سب میرے ہی جتھے ہیں ۔ وہ سب میں ہوں "میں" ۔

تم کیوں اصرار کرتی ہو ؟

اصرار ؟ کس بات پر ؟

ہر بات پر ؟

مثلاً ۔

مثلاً یہی کہ تم ہر قبر میں موجود ہو ۔ بلکہ ہر ایک کی قبر میں چاہے وہ انسان کی ہو یا نہ ہو ۔

تم کیوں اس بات کو نہیں مانتیں ۔ میں ہر قبر میں زندہ ہوں ۔ میں ہر قبر میں ہوں ناں ۔

میں کیسے جان لوں ؟

مت مانو مگر یہ سچ ہے کہ میں ..... اور پھر تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ میں خود جو اپنی بات مانتی ہوں ۔ میں خود یہ یقین کرتی ہوں میرے لیے یہی بہت ہے ۔ یہ ہی بہت ہے ۔

اور —— اگر یہ بہت نہ ہوا تو ؟

تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے ؟ کسی کو بھی کیا فرق پڑتا ہے ؟

کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بات پہ فرق تو ضرور پڑتا ہے ۔

کہاں فرق پڑتا ہے اور کس بات پر ؟

یہی کہ تم دوسروں کے بارے میں فکر مند ہو کہ نہیں ۔ تم دوسروں کا خیال رکھتی ہو کہ نہیں ؟

سُنو ! میں دوسروں کے بارے میں اُس وقت فکر مند ہوتی تھی جب وہ میری فکر کرتے تھے اور اب میں اپنا خیال رکھتی ہوں اس لیے دوسروں کا خیال رکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی ۔

تم اس وقت خود کو جھٹلا رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم دوسروں کی فکر ہی کرتی ہو۔ اپنا خیال تو بھولے سے بھی تمہیں نہیں آتا اور رہی بات فرصت کی تو فرصت تلاش کی جاتی ہے۔

"تلاش" ہاں اچھا لفظ ہے تلاش جانتی ہو میں بھی اپنے والدین کی تلاش میں، بہن بھائیوں کی تلاش میں برسوں تک بھٹک رہی ہوں۔

سچ کہوں۔ دراصل تم نے کبھی اُن کی تلاش کی ہی نہیں تھی پھر بھٹکنے کا سوال کہاں سے آگیا۔ تمہیں تو اپنی تلاش تھی۔ اپنی کھوج میں نکلی تو تم نے اُن کی تلاش کی۔

مگر میں بظاہر زندہ تھی پھر مجھے خود کو تلاش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ہاں! یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم اُن کے حوالے سے اپنی شناخت چاہتی تھیں۔ تمہیں اپنا نام چاہیے تھا۔ اس لیے تم نے ماں کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

ماں۔ ماں۔ ماں۔ آج۔ آج میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

تم کسقدر جھوٹ بولتی ہو۔ تمہاری ماں کہاں ہے؟ کبھی تم کہتی ہو کہ تمہاری ماں تمہاری پیدائش کے فوراً بعد کھو گئی تھی کبھی کہتی ہو وہ کسی حادثے میں مر گئی کبھی کہتی ہو وہ کسی اور مرد کے ساتھ زندگی کرنے کے لیے تمہیں تنہا چھوڑ گئی۔ کبھی کہتی ہو تمہاری ماں تمہیں آیا کی گود میں رکھ کر بھول گئی۔ کبھی کہتی ہو تمہاری ماں کو کوئی اغوا کر کے لے گیا۔ کبھی کہتی ہو اُس کی لاش کھیتوں سے ملی ہے۔ کبھی کہتی ہو کہ تمہاری ماں صرف نوکرانی بنی باورچی خانے میں گھر کے دوسرے کمروں میں کام کرتی پھرتی ہے اور تمہارے کمرے میں جھانکتی ہی نہیں۔ یہ اُس کے کام کا حصہ نہیں۔ آخر آخر تمہاری ماں ہے کہاں؟ اگر وہ ہے تو بتاؤ کہاں ہے؟ کہاں ہے تمہاری ماں؟

تم پوری بات توجہ سے سُنتی نہیں ہو اور بحث کرنے چلی جاتی ہو سنو! میری ماں اب غور سے سُنو! آج میری ماں بلکہ میری مائیں مجھے بس میں لیے جب میں جناح سپر مارکیٹ سے میلوڈی تک کا سفر کر رہی تھی تب میں درحقیقت ساری زندگی کے سفر سے گذر رہی تھی۔ ایک کا نام بیگم اکمل تھا اور دوسری کا نام بیگم علوی۔ کیا تم جانتی ہو کہ میرے باپ کا نام اکمل علوی ہے۔ میرے باپ کا یہ نام، میرے تمام سرٹیفکیٹ میں یہی نام درج ہے بلکہ تمام ڈگریوں تمام اہم کاغذات میں ولدیت کے خانے میں یہی نام لکھا جاتا ہے تب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جیسے میں اُن دونوں کی بیٹی ہوں یا پھر اُن دونوں کے شوہروں کی بیٹی ایک ماں تو دوسرے اسٹاپ پر ہی مجھ سے بچھڑ گئی اور دوسری ـــــ سُنتی ہو ـــــ وہ دوسری میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ اُس کا لمس بھی میں نے محسوس کیا تھا۔ ماں کی مہک بھی اس کے بدن سے آرہی تھی۔ اُس نے مجھ سے

بات بھی کی تھی۔ اپنا فون نمبر دیا تھا اور گھر آنے کی تاکید بھی کی تھی۔ اُس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا ہائے اُس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا اور میرا اسٹاپ آگیا۔ میں اُسے بتا بھی نہ سکی کہ میں تمہاری یا تمہارے شوہر کی بیٹی ہوں۔ میں نے ایک بار پھر اپنی ماں کو کھو دیا۔ کسقدر دُکھ کی بات ہے میں نے ایک مرتبہ پھر اُس عورت کو کھو دیا جس نے میرے باپ کے ساتھ مل کر میرا خواب دیکھا تھا۔ میرے خد و خال بنائے۔ مجھے اپنا لہو دیا ——— میرا نام رکھا مجھے زندگی سنوارا اور وہ ہر جگہ میرا راستہ روکے کھڑی رہی ہر جگہ۔ اُن جگہوں پر بھی جہاں اُس کی موجودگی کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اُن مقامات پر بھی جہاں اس کے وجود کا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ وہ موجود تھی۔ مگر کیسے کہ میں اُسے چھو نہیں سکتی تھی بس پکار سکتی تھی۔ میرا تن من پکار بن گیا۔ ماں۔ ماں۔ ماں۔ آ۔ آ میرے پاس آ ——— کہ میں تجھ سے شدید نفرت اور بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ ہاں میں چیخ چیخ کر اعتراف کرتی ہوں ساری کائنات کے سامنے ایک لڑکی اعلان انقلاب کرتی ہے۔ انقلاب آچکا ہے۔ میں معاشرے کے مروجہ قوانین اور رسم و رواج کو تسلیم نہیں کرتی، میری ذات میں ایک بہت بڑا انقلاب آچکا ہے جس نے میری ہستی کی جڑیں اکھیڑ دی ہیں اب میں نئے انداز سے زمین میں اُگتی ہوئی نئے معاشرے میں نیا جنم اور اپنی زندگی کا پہلا سانس جو میں نے اپنی خاطر اپنے آپ میں لیا۔ جب زندگی میرے بدن میں داخل ہوئی تب پہلا سانس پہلا سکھ میں نے لیا۔ پہلا سکھ!

سکھ کیا ہے؟

اصل میں یہ تو بہلاوا ہے بہانہ ہے زندہ رہنے کا۔

کیا تم بہانوں سے زندگی گزارتی ہو؟

ہاں تمہیں کیا پتہ زندگی کیا ہے؟ کتنی مشکل ہے کتنی پریشان۔ کتنی کٹھن۔ کتنی مضطرب کتنی بے چین۔ کتنی اُداس۔ کتنی تنہا۔ کتنی دُکھی۔ تم کیا جانو؟ بہانے نہ ہوں تو انسان ایک پل بھی زندہ نہ رہے۔

تم کیا سمجھتی ہو انسان زندہ ہے؟

ہاں! انسان زندہ ہے اور انسان مُردہ ہے۔ انسان زندہ اور مُردہ ہے۔

تمہاری ہر بات دوراہے پہ آکر کیوں ٹھہر جاتی ہے؟

کیوں کہ میں نے دوراہے سے ہی زندگی حاصل کی۔

دوراہے سے؟

ہاں ماں اور باپ کا دوراہا ۔ عورت اور مرد کا دوراہا ۔ محبت اور نفرت کا دوراہا ۔ سچ اور جھوٹ کا دوراھا ۔ زندگی کا ہر لمحہ کیا ہے ۔ یہی تو ہے ۔ دوراہا ۔ دوراہا !

ہاں دوراہا !

آگہی

تم خواب دیکھتی ہو؟

ہاں میں بھی خواب دیکھتی ہوں۔ بہت سے خواب۔

خواب کیسے ہوتے ہیں اور لوگ کیسے دیکھتے ہیں؟

ہاں تم نے اچھا سوال کیا۔ دراصل ہماری ساری زندگی طویل اور مسلسل خواب کے ٹوٹے ہوئے مختلف حصوں کی طرح ہے۔ مختلف حصوں میں بٹی ہوئی زندگی.....

اچھا تو یہ بچپن۔ جوانی۔ بڑھاپا.....

ارے چھوڑ دو یہ پھر بتاؤں گی پہلے تمہارے سوال کا جواب دوں۔ میں بہت سے خواب دیکھتی ہوں۔ خواب زندہ رہتے ہیں بس نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ رنگ بدلتے جاتے ہیں۔ جیسے پہلے خاموش فلموں کا دور تھا۔ پھر بلیک اینڈ وائٹ اور اس کے بعد فلمیں رنگین بلکہ پھر گہری نیلی ہو گئیں.....

گہری نیلی فلمیں۔ یہ گہری نیلی فلمیں کیا ہوتی ہیں؟

یہ بھی بس ہوتی ہیں۔ تم ابھی نہیں سمجھو گی جب دیکھو گی تب سمجھو گی۔ بلکہ برسوں بعد جانو گی۔ یہ فلمیں بھی دراصل لوگوں کا خواب ہوتی ہیں جنہیں روح نہیں صرف جسم اداکاری کرتے ہیں۔

کیا روح کی رضا کے بغیر بھی اداکاری ہوتی ہے ؟

ہاں بیشتر لوگ کرتے ہیں ۔

کیسے لوگ ؟

یہ بات تم زندگی کے مطالعے کے بعد جان سکو گی ۔ میں تو بات کر رہی تھی اُن فلموں کی جن میں صرف جسم اداکاری کرتے ہیں ۔ صرف اور صرف جسم . . . . .

تم جسم کے لفظ کو اتنے غلط لہجے میں کیوں استعمال کرتی ہو ؟

کیونکہ میں جانتی ہوں جسم کیا ہے ؟ لوگوں نے اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا ہے انسان جب تک انسان رہے ۔ تب تک وہ قابلِ برداشت اور خوبصورت نظر آتا ہے مگر جب انسان کی حیوانیت بیدار ہو جائے تو وہ ناقابلِ برداشت اور نہایت بدصورت ہو جاتا ہے ۔ مکروہ صورت . . . . .

کیا ہر انسان ؟

ہاں ! ہر انسان اور میں نے یہ بات صرف جسم کے حوالے سے نہیں کی ہر حوالے سے کہی ہے ۔ جب انسان حیوان بنتا ہے تو اُس کی آنکھوں پہ پٹی بندھ جاتی ہے اور اندھے انسان کا پاگل پن تم نہ دیکھو نہ جانو تو اچھا ۔ تمہیں کیا خبر ؟ دراصل مرد ایک عجیب مخلوق ہے کبھی کبھی جب یہ خود کو انسان سمجھنا بند کر دیتا ہے ۔ اور جنگلی جانور بن جاتا ہے ۔ تب وہ واقعی کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے ۔ کسی کُتے کی طرح سڑکوں پہ آوارہ پھرتا ہے ۔ کسی بھی تلاش میں وہ عورت کے سامنے دُم ہلاتا رہتا ہے ۔

کیا عورت مرد کو میرا مطلب ہے اُس مرد کو جو کتے کا روپ دھارے اُسے ہڈی دے دیتی ہے ؟

ہاں ہوس آنکھوں سے خون بن کر ٹپکتی ہے تو کچھ عورتیں اپنا آپ ہڈی کی طرح اُس کے آگے پھینک دیتی ہیں ۔

کیا تمام عورتیں ؟

نہیں تمام نہیں مگر ہاں بیشتر عورتیں ؟

کیا چبائی ہوئی ہڈیاں بھی لوگوں کے کام آتی ہیں ؟

ہاں آتی ہی رہتی ہیں اور سب لوگ کہاں جانتے ہیں کہ ہڈی چبائی ہوئی ہے کہ نہیں ۔ کچھ بظاہر بہت اچھی لگتی ہیں مگر اندر سے ——————— .

اُف ! مجھے تو ایسے منظر سوچ کر ہی نفرت ہو رہی ہے گھن آتی ہے ۔ سُنو ! کیا مرد ہر عورت کے سامنے دُم ہلاتا ہے ۔

ہاں تقریباً ہر عورت کے سامنے ۔ کیونکہ ہر مرد کی عورت مختلف ہوتی ہے ۔

اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ تم کیسی عورت ہو ؟ ۔

میں کیسی عورت ہوں ؟ میں ایک مکمل عورت ہوں میری خواہش ہر جاہل اور باشعور شخص کر سکتا ہے

جاہل کیوں ؟

اس لیے کہ میں ہر اعتبار سے مرد کو سکھ دے سکتی ہوں ۔

یہ مرد کا سکون کیسا ہوتا ہے ؟

مرد کا سکون ـــــ مرد بہت نامطمئن اور ناخوش رہنے والا انسان ہے اسے سکون دینے کی خاطر عورت اپنا آپ لٹا دیتی ہے مگر وہ پیاسا ہی رہتا ہے اُس کی بھوک اُس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی کبھی نہیں بجھتی اور کبھی تو ایک ہی پل میں اچانک بجھ جاتی ہے ۔ اس طرح کہ اُسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا ۔ جب ہوتا ہے تو اُسے سیراب کرنے والی بدلی کہیں بہت دُور جا چکی ہوتی ہے ۔ جب کوئی شے دسترس میں نہ رہے تب وہ عزیز ہو جاتی ہے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے ۔ انسان اس کی خواہش میں تڑپتا ہے بلکتا ہے ۔ جیسے ماں باپ کی موت کے بعد اولاد کو اپنی کوتاہیوں کا خیال آتا ہے ۔ اولاد سوچتی ہے کاش ہم نے انہیں کوئی دُکھ نہ دیا ہوتا ۔ کاش ہم نے اُن کی خواہشات کا خیال رکھا ہوتا ۔ مگر زندگی بھر انسان اس کاش کے چنگل سے آزاد نہیں ہو پاتا ۔ اس گرداب میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے ۔ ۔ ۔

تم نے اُداسی بکھیر دی ہے ۔ چھوڑو ان باتوں کو ۔ تم نے تو بہت سے انسانوں کو قریب سے دیکھا ہے ۔ ہے ناں ؟

ہاں مگر ان انسانوں میں انسانوں والی باتیں بہت کم تھیں ۔ کئی لوگوں میں تو نہ ہونے کے برابر تھیں

کیا بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جن میں انسانیت زندہ تھی ؟

ہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے مگر بہت سے انسانیت کو دفنا چکے تھے ۔

خیر اب تم انسان اور انسانیت کی بحث چھوڑو صرف مردوں کی بات کرو ۔

تم نے تو ہر قسم کے مرد دیکھے ہیں ۔ کیسے ہوتے ہیں یہ مرد لوگ ؟

بس ایسے ہی ہوتے ہیں یہ مرد ۔ کچھ مردوں میں تو کچھ باتیں یکساں ہوتی ہیں اور کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ان کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے جبکہ کچھ باتیں مختلف مردوں میں مختلف انداز سے ہوتی ہیں ۔ کچھ خوبیاں کچھ خامیاں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن بعض باتیں محض چند شخصیات کا حصّہ ہوتی ہیں ۔

مگر وہ کیسے ؟

وہ ایسے کہ پڑھے لکھے مردوں کی ضروریات اور خواہشات مختلف ہوتی ہے ۔

وہ کیا چاہتے ہیں ؟

وہ چاہتے ہیں کہ عورت ذہنی طور پہ بھی خوبصورت اور پختہ ہو ۔ کہی اور ان کہی تمام باتیں اسی سطح پہ سمجھے جس سطح پہ کہی جا رہی ہوں ۔ ایک بات اور مرد چاہتا ہے کہ عورت بولڈ ہو ۔

یہ بولڈ عورت کیسی ہوتی ہے ؟

وہ جو مردوں کو کلین بولڈ کر دے ۔

اچھا ؟

ہاں مرد کسی عورت کے سامنے ہارنا نہیں چاہتا مگر لاشعوری طور پہ وہ اس شکست کا خواہشمند ہوتا ہے وہ چاہتا کہ کوئی ہو جو اُسے کرچی کرچی کر دے ۔ اُسے ہلا کے رکھ دے اس طرح کہ اُسے دوبارہ اپنی شخصیت بنانا پڑے ۔ مرد اپنی تکمیل چاہتا ہے وہ جانتا ہے کہ عورت ہی اُسے مکمل کر سکتی ہے ۔ عورت ہی ہے جو مرد کی شناخت کراتی ہے اور مرد سے اُس کا اپنا آپ ملواتی ہے ۔

اپنا آپ ملواتی ہے ؟

ہاں عورت ہی مرد کا آئینہ بن کر اس کے نقش اُسے دکھاتی ہے ۔

وہ کیسے ؟

دراصل محبت وہ جذبہ ہے جسمیں عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے میں اپنا عکس تلاش کرتے ہیں اور خود شناسی کے عمل سے واقف ہیں ۔ محبت ہم کسی دوسرے فرد سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہی کر رہے ہوتے ہیں ۔

لیکن وہ کس طرح ؟

جب ہم کسی میں اپنا عکس دیکھتے ہیں ، اپنا چہرہ اپنا کوئی روپ تو ہم اپنے اس روپ سے محبت کرتے ہیں ، دوسرے شخص سے نہیں ۔ دیکھو ! جب ہمیں کوئی اپنا جیسا نظر آتا ہے تو ہم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ اُس میں اپنا آپ ملتا ہے اس لیئے ۔ اسلیئے نہیں کہ اُس میں ہمیں کوئی خوبی نظر آتی ہے ۔ دوستی اور محبت کی وجہ بھی یہی مشترک خصوصیات بنتی ہیں ۔ رہی متاثر ہونے والی بات تو میری پیاری متاثر ہونا بہت بڑی بات ہے ۔ جو ہمارے پاس نہیں ہے ۔ ہم کسی کی خوبیاں تسلیم نہیں کرتے کہ ہم کم ظرف ہیں ۔ مگر دل ہی دل میں کسی ایسے شخص کی کشش کے اسیر ضرور ہوتے ہیں ۔ جو ہم سے بہتر ہو ۔ یہ بات پھر ہمارے ظرف کی ہے کہ ہم اُس سے حسد کرتے ہیں یا رشک ۔

تم بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو؟ مجھے بتاؤ کہ فنکار قسم کے مرد کیسی عورت پسند کرتے ہیں؟
وہ جو اُن سے اونچی فنکار ہو یا وہ جو ان سے کم درجے کی ہنرمند ہو۔ مرد عموماً رشک کا شکار نہیں ہوتے۔
اُن کا حسد۔ اُن کا انتقام خدا کی پناہ بہت شدید ہوتا ہے۔
مگر اُس دن تو ایک شخص تم سے کہہ رہا تھا کہ آپ تو جسم فنکار ہیں!
ہاں: دراصل وہ خود بلکہ وہی کیا بیشتر لوگ بہت بڑا ڈرامہ ہوتے ہیں۔ اُن کے اندر باہر طویل ڈرامہ چلتا رہتا ہے اور ہم میں سے بہت سے لوگ جان نہیں پاتے۔
بہت سے لوگ جان نہیں پاتے؟
اس لیے کہ وہ کم علم ہوتے ہیں۔ اور تجربے کا زہر پیے بغیر زندہ ہوتے ہیں۔
تجربے کا زہر کیا ——؟
اوہ تم نہیں جانتیں۔ دراصل تجربے کا زہر پہلے آنکھوں میں پھر دل میں پھر روح میں اتارنا پڑتا ہے اس کے لیے زندگی کی پاتال میں اترنا پڑتا ہے۔
پاتال کیا ہے؟
تم نے فہمیدہ ریاض کو نہیں پڑھا اس لیے تمہیں نہیں پتہ اور میں ہر بات تمہیں کیوں سمجھانے بیٹھوں!
چلو کچھ اور مت بتاؤ مگر اتنا تو بتا دو کہ خواب کیسے دیکھتے ہیں؟ میں بھی دیکھوں گی۔
بھئی خواب دیکھنے کیلئے کچھ بھی تو نہیں کرنا پڑتا اور بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں۔
وہ کیسے؟
بس اُن کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور وہ اپنی مرضی کے خواب دیکھ لیتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے کچھ لوگ نیند میں چلتے ہیں۔ چلتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی انجان اجنبی راستوں پر اور کبھی جانے پہچانے راستوں پر۔ دراصل سب کا مسئلہ سفر ہے۔ منزل کی کھوج ہے۔ وہ منزل جو کہیں نہیں ہوتی اور ہر جگہ ہوتی ہے —— ہاں تو بات ہو رہی تھی خواب کی جو لوگ سوتے میں خواب دیکھتے ہیں۔ اُن کے کچھ خواب تو اتنے سہانے ہوتے ہیں کہ وہ اس کو حقیقت جان کر اسی میں ساری زندگی گذار دیتے ہیں اور کبھی کبھی تو خوفناک خواب ڈرا بھی دیتے ہیں۔
خوفناک —— خوفناک خواب؟
ہاں خوف ناک خواب زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرح اندر باہر کڑواہٹ بھر جاتی ہے۔ اور انسان کا

دم گھٹنے لگتا ہے پھر خواب دیکھنے کی عادت چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ خواب تو وہ جو آنکھوں میں بھرے جا سکیں۔ رنگین خواب۔ تتلیوں کے خواب۔ پھولوں کے خواب۔ خوابوں کے خواب۔ بھلا ایسے خواب کیوں دیکھے جائیں جن سے حیرت سے آنکھیں پھٹنے لگیں یا خوف سے سکڑنے لگیں۔ یا ان خوابوں کی تعبیر الٹ ہونے کا دکھ انسانوں سے خواب چھیننے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے خواب خوابوں کو کھا جاتے ہیں۔ تمہیں ایک بات بتاؤں کچھ لوگ جاگتی آنکھوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ مجھے ایسے خواب بہت اچھے بہت اپنے اپنے لگتے ہیں۔

میں بھی تمہیں اچھی اور اپنی لگنا چاہتی ہوں۔ میں بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھوں گی۔

ہونہو! مگر تمہاری آنکھیں کہاں ہیں؟ تمہارا چہرہ کہاں ہے؟

آخر کوئی تو بے چہرہ عورت بھی ہوگی۔

ہاں! ہزاروں ہیں جو جسم ہیں اور استعمال کے بعد اُن کا نام اُن کا چہرہ بھی کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا جاتا ہے۔

مگر میں تو اُن میں سے نہیں ہوں۔ مجھے تو کسی نے کبھی نہیں چھوا۔

تم نظر آؤ گی تو سبھی ہاتھ بڑھیں گے۔ سبھی ہاتھ تمہارا ماس نوچنے کو ہزاروں ناخن بڑھیں گے۔ لاکھوں خونخوار آنکھیں تمہیں نفرت سے دیکھیں گی اور لوگوں نے آگ پہن رکھی ہوگی۔ وہ تمہارے گرد رقص کریں گے تاکہ تمہیں اپنے گروہ میں شامل کر سکیں۔

یہ گروہ کیا ہوتا ہے؟

چند لوگ مل کر اپنی مرضی سے کوئی تنظیم یا گروہ کی شکل نکال لیتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک ہی خیال کے ایک ہی عقیدے کے ہوتے ہیں در حقیقت وہ سب ایک دوسرے کی مخالف سمت میں سفر کر رہے ہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

ہاں اس سے کیا فرق پڑتا ہے دراصل سب لوگ چاہتے ہیں کہ تم اُن کے ساتھ زندگی گزارو۔

مگر میں اُن سب کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتی ہوں۔

سب کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں تو چند کے ساتھ گزار لو۔

چند کے ساتھ؟

ہاں جو تمہارے دوست ہیں۔

میرے دوست؟ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔

اور وہ جس نے تمہارا ہاتھ تھاما تھا . . . . . .

دراصل اس وقت میں نے اپنا ہاتھ تھام رکھا تھا بلکہ اس وقت بھی کیا میں نے تمام وقتوں میں اپنے ہی ہاتھ کو تھاما ہے۔

حیرت ہے تمہیں تو کتنے ہی ہاتھ ملتے تھے پھر . . . . . ؟

ہاں بہت سے ہاتھ ملتے تھے ؟ ملتے ہیں مگر وہ تمام صرف ہاتھ ہیں۔ تم بھول جاتی ہو۔ کہ اُن ہاتھوں میں روح کبھی شامل نہ تھی۔ روح تو موجود ہی نہیں تھی۔

ایک تو تم ہر بات میں روح کو خواہ مخواہ گھسیٹ لاتی ہو۔

کیا کروں عادت سے مجبور ہوں ؟

کون سی عادت سے ؟

بہت سی عادتوں سے ——— ۔

مثلاً

مثلاً یہ کہ میرے سامنے لوگوں کے سبھی نقاب چہرے کی ریلنگ سے نیچے زمین پہ آرہتے ہیں۔ میں جھوٹ اور منافقت برداشت کر ہی نہیں سکتی۔

کیا اسے عادت کہنا ضروری ہے ؟

نہیں اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ تم اسے مزاج بھی کہہ سکتی ہو۔

تم تو بہت سی عادتوں اور مزاجوں سے واقف ہو اتنے لوگوں کو بھگتتے بھگتتے۔

تم تھکیں نہیں !

آہ ! تھکن۔ تھکن اب میرا راستہ نہیں روکتی اور تم نے حل من مزید سُنا ہے ناں بس وہی بات ہے۔ اب میں تھکتی نہیں پہلے پہلے میں تھک جاتی تھی۔ ڈھے جاتی تھی۔ گر جاتی تھی۔ اب میں گرتے ہوؤں کو اُٹھا لیتی ہوں۔ میں بہت دور تک بہت دیر تک چلتی چلی جاتی ہوں۔ سرد راتوں میں ننگے پاؤں برہنہ سڑکوں کے بدن پر چلنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت ہی اچھا لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی بدن پہ پاؤں دھرتی ہوں اور قدموں کی آواز بھی نہیں آتی ہے ناں عجیب بات ——— حیرت کی بات . . . . . !

نہیں ممکن ہے بہت سے لوگوں کو بھی تمہاری آواز نہیں آتی ہو گی۔ آواز آتی تو ہو گی مگر وہ گونگے بہرے ہیں۔ آواز کی دُنیا سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ آواز کی دنیا ہی کیا اُن کا کسی بھی دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

تمہارا کس دنیا سے تعلق ہے ؟

میرا تعلق ہر دُنیا سے ہے ۔ میں ہر دور ہر وقت کی آواز ہوں بلکہ میں وقت اور دُنیا کی قید سے نکل چکی ہوں ۔ میں تو اپنے بدن کی قید سے بھی برسوں پہلے رہائی حاصل کر چکی ہوں میں ایک آزاد عورت ہوں جو دُنیا کو نئی آنکھ سے دیکھتی ہے ۔

نئی آنکھ! تمہاری پرانی آنکھ کیا ہوئی ؟

پرانی آنکھ کے کیمرے سے جتنے منظر عکس بند کرنا تھے وہ کر لیے ۔ فلم ختم ہو گئی تھی میں نے اسے ضائع کر دیا ۔ اب میری آنکھ کی پُتلیوں میں نئی فلم کی ریل چل رہی ہے ۔

تم فلم بناتی ہو ؟

ہاں فلم بھی بناتی ہوں ۔

اور ؟

اور تصویر بناتی ہوں ۔

اور ؟

اور نظم اور کہانی بس ناجائز اولاد پیدا کرتی ہوں ایسی اولاد جس کی ماں بھی میں باپ بھی میں ۔

کیا تم ان تخلیقی کاموں کو غلط سمجھتی ہو ۔ ناجائز سمجھتی ہو ؟

میں نہیں لوگ ایسا سمجھتے ہیں ۔ میں تو بہت فخر سے سر اونچا کر کے اعلان کرتی ہوں کہ ہاں اگر یہ جرم ہے تو میں اقرار کرتی ہوں کہ میں مجرم ہوں جو سزا دینا چاہو دے دو ۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں ناجائز اولاد کی خالق ہوں ۔

تم تو بنانے کی بات کر رہی تھیں ناں ——— ؟

ہاں : تم اور کیا پوچھنا چاہتی ہو ؟

یہی کہ کیا تم انسانوں کو بنانا بھی جانتی ہو ۔

ہاں میں انسانوں کو بنانا بھی جانتی ہوں بلکہ بہت خوب جانتی ہوں ۔

بننا بھی جانتی ہو ؟

ہاں بننا اور بن بن کے بگڑنا بھی جانتی ہوں ۔

کیا تم سبھی کچھ جانتی ہو ؟

ہاں میرا سکھ اور میرا دکھ بھی یہی ہے کہ میں سبھی کچھ جانتی ہوں ۔ میں سب کچھ جانتی ہوں ؟ ہاں! میں سب کچھ جانتی ہوں ۔ سب کچھ جانتی ہوں !

برزخ

تم پہلی مرتبہ کب مسکرائی تھیں ؟

پہلی مرتبہ ـــــ بہت پرانی بات ہے شاید بچپن کی بات جب میرے ماتھے پر بوسہ دیا گیا تھا۔ تب مسکرائی تھی ۔

اور آخری مرتبہ ؟

آخری مرتبہ جب دُکھ نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا تھا میں مسکرائی تھی اور پھر میں نے رونا بلکہ مسلسل رونا سیکھ لیا تھا ۔

اوہ ! تو کیا تمہیں روتے ہوئے سارا بچپن اور جوانی لگ گئی ۔

ہاں ! بچپن اور جوانی لگ گئی ۔ جسطرح لوگوں کو نظر لگ جاتی ہے ناں اسی طرح مجھے خواہشوں کی نظر لگ گئی اور پھر ساری زندگی لمحہ لمحہ میں لہو سے اپنی نظر اتارتی رہی ۔ تم جانتی ہو میں ..... مگر تم کچھ نہیں جانتیں جسطرح کوئی دوسرا شخص نہیں جانتا کہ میں کیا سوچتی ہوں ؟ کیا کرتی ہوں ؟ کیوں کرتی ہوں ؟

چلو تم خود ہی بتا دو کہ تم کیا سوچتی رہتی ہو ؟

میں سوچتی ہوں کہ ..... مگر میں کوئی ایک بات کہاں سوچتی ہوں ۔ میں تو ہزاروں لاکھوں باتیں سوچتی ہوں ۔ جیسے سب لوگ ظاہر پہ کیوں جاتے ہیں ۔ جسم کو ہی کیوں دیکھتے ہیں ، دل اور روح

کو کیوں نہیں جاننے کی کوشش کرتے آخر کوئی تو ایسا بھی ہونا چاہیے جو آپ کے ظاہری حُسن سے متاثر نہ ہو بلکہ آپ کے اندر بھی جھانک کے دیکھ سکے کہ آپ کتنے اُداس اور تنہا ہیں۔ آپ کی خواہشات کے بارے میں جانے مگر ہاں کوئی بھی کسی کے بارے میں کیسے جان سکتا ہے اور مکمل طور پر کسی شخص کو جاننا کسقدر دشوار ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ آپ کے اندر کیا ہے؟ کیوں ہے؟ زندگی کا ہر لمحہ اپنے پیچھے ایک بڑا سوال چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے۔ آگے اور آگے بہت آگے اور آپ گھنے جنگلوں سے گذرتے چلے جاتے ہیں۔ آہستگی سے چُپ چاپ، چپ چاپ مگر چپ کی چاپ بھی کوئی نہیں سُنتا۔ وہ بھی نہیں جو دعوے کرتے ہیں۔ وہ بھی نہیں جو کچھ نہیں کہتے اور پھر ہر آواز سُننے کے لیے نہیں ہوتی جسطرح ہر آواز سُنائی جانے والی نہیں ہوتی۔ ارے لو میں بھی کیسی باتیں کرنے لگی ہوں تم تو شاید سُن ہی نہیں رہیں۔ اگر سُن رہی ہو تو سمجھتی نہیں مگر میرا جی چاہتا ہے کہ تم میری باتیں سُنو اور سمجھو۔ کوئی تو ہو۔ . . . . کوئی تو ہو جو میرے علاوہ بھی میری بات سُنے سمجھے، مجھے سمجھے مجھے جانے۔ کوئی تو ہو۔

تم آخر سمجھانا کیا چاہتی ہو؟

میں آخر کیا سمجھانا چاہتی ہوں۔ میں تو ہزاروں لاکھوں باتیں سمجھانا چاہتی ہوں اور شاید کوئی بھی بات نہیں سمجھانا چاہتی۔

یہ تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ الجھی الجھی۔ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔

چلو ایک سمجھ میں آنے والی بات بتاتی ہوں۔ بہت پہلے کی بات ہے۔

کتنے پہلے کی بات ہے؟

شاید برسوں پرانی۔ صدیوں پرانی۔ چند دن پرانی۔ چند گھنٹوں پرانی یا چند منٹ پرانی بات ہو مگر عرصے سے کیا ہوتا ہے؟ بھلا ہم عمروں کو برسوں سے کیوں ناپتے ہیں۔ ہم عمروں کو تجربوں سے کیوں نہیں ناپتے۔ ہم اپنے پیمانے کیوں نہیں تبدیل کرتے؟ ان گھسے پٹے ہندسوں پر چلتے چلے جائیں گے؟

یہ ہندسے کیا ہوتے ہیں؟

ہندسے صفر سے ۱ ۲ ۳ سے لے کر لاکھ کروڑ تک زندہ ہوتے ہیں۔

یہ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

بس یونہی۔ دائروں میں سفر کرنے کا نام ہندسہ ہی تو ہے۔ صفر بڑھاتے جاؤ ہندسے بھی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے کبھی تو بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں اور کبھی کچھ بھی نہیں۔ ہندسے دراصل کائنات میں پھیلی ہوئی وہ رقم ہے) وہ دولت ہے جو مخصوص ہاتھوں میں رہتی ہے اور باقی ہاتھ خالی ہی

رہتے ہیں۔

خالی ہاتھ سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟

وہ ہاتھ جن پہ کئی لکیریں ہوں۔ مگر اس خوش بختی کی لکیر پڑھی نہ جا سکے، نظر نہ آ سکے۔ "ہاتھ"۔ ہاتھ سے ہاتھ باتیں کرتے ہیں محبت سے، نفرت سے جُدا ہو جاتے ہیں اور اپنے سینے میں کینہ پالتے ہیں۔ کبھی ان ہاتھوں میں پھول ہوتے ہیں۔ کبھی ہتھیلی لہو کے رنگ میں ہوتی ہے کبھی ہاتھ دوسرے کا لہو بہاتے ہیں اور کبھی اپنا۔

کیا کوئی اپنا لہو بھی بہاتا ہے ؟

ہاں جب کوئی شخص دوسروں کا درد کرے اُن کا بہت خیال رکھنے لگے تو اپنا خیال رکھنا یاد نہیں رہتا بلکہ بعض اوقات خود بُھلانا پڑتا ہے۔ تاکہ دوسروں کو دُکھ نہ ملے۔ اذیت نہ ملے۔

اذیت کیا ہوتی ہے ؟

اذیت ایک بہت بڑا لفظ ہے اس لفظ کی چھاتی میں دکھوں کا کینسر ہے کینسر۔ میں اذیت کی جائی ہوں۔ تم جانتی ہو۔ تم سنتی ہو۔ میں اذیت کی جائی ہوں اور اُداسی کی تپتی دوپہر میں پیدا ہوئی ہوں۔

تم پیدا ہوئی تھیں ؟

ہاں میں پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی۔ اور تب سے اب تک لاکھوں مرتبہ مر چکی ہوں۔

کیا تمہیں موت پسند ہے ؟

ہاں مجھے موت بھی پسند ہے۔ مگر کیسی موت ؟ ٹھہرو! مجھے سوچنے دو۔ میں تو موت میں ہی رہتی ہوں۔ میری زندگی کے ساتھ ایک ہی نام لکھا تھا۔ "موت" میں مُردہ خانم ہوں۔

کیسا عجیب نام ہے۔ مُردہ خانم

ہاں تم اسے مُردہ خانہ بھی کہہ سکتی ہو۔

ہائے اس نام میں تو بہت دُکھ ہے۔

جانتی ہو اس نام سے تو میری روح اب تک کانپ رہی ہے۔ میری روح برسوں سے کانپ رہی ہے۔ میں برسوں سے کئی وجوہات کی بنا پر کانپتی ہوں۔ میں کانپتی ہوں

تم کانپتی کیوں ہو ؟

اس لیے کہ میں دھرتی ہوں۔ وہ زمین ہوں جو لاکھوں دُکھوں سے کانپتی ہے اور کسی کو اپنا درد نہیں کہہ سکتی۔

کسی کو اپنا درد کیوں نہیں کہہ سکتی ؟

اجازت نہیں ہے اور میری زبان بھی پیاسی ہے ۔ تم جانتی ہو ۔ جب میں پیدا ہوئی تھی تب سے اب تک پانی کا قطرہ بھی کسی نے میری روح میں نہیں ٹپکایا ۔ میری زبان پہ کانٹے چبھتے ہیں اور میرے خشک سفید ہونٹوں سے لہو رستا ہے ۔

صرف ہونٹوں سے ؟

نہیں میرے جسم سے میری روح سے لہو کے فوارے پھوٹتے ہیں اور میں اندر باہر سے سُرخ لہو کے رنگ میں رنگی گئی ہوں ۔

تمہیں یہ رنگ بہت پسند ہے ؟

ہاں اپنے نام کی طرح اس رنگ میں بھی شدت محسوس ہوتی ہے ۔ اس رنگ میں موت ہے اذیت ہے دکھ ہے تڑپ ہے اور . . . . . .

میں مجبوراً تمہاری بات کاٹتی ہوں سنو ! کچھ دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ تمہارا نام . . . . . .

ہاں ۔ ہاں ۔ ہاں میرا نام مردہ خانہ ہی ہو سکتا ہے جہاں ہر لمحہ نئی موت آتی ہے ۔ نیا چہرہ نئی روح ۔ نیا عذاب اور میں مُردہ انسانوں سے نہیں ڈرتی ۔

مجھے تو ڈر لگتا ہے ۔ دیکھو دیکھو کافور کی بُو پھیل گئی ہے ۔ سونگھو تو بھی ۔ کافور کی بُو ——————

تم پاگل ہو ناں اس لیے خوشبو کو بُو کہتی ہو ۔ مُردہ انسان تمہیں کسی نئے امتحان میں نہیں ڈالتے اور یہ زندہ انسان تو امتحانوں کی سُلگتی بھٹی میں بار بار جھونکے ہیں جیسے کی پشتوں سے تمہارا بدن اور روح جل جاتا ہے مگر وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوتے اور یہ جو دوزخ ہے ناں یہ بھی تو ایسی دُنیا ہی ہے ۔ کیا میں دوزخ میں زندہ نہیں ہوں ؟ کیا میں دوزخ میں زندہ نہیں ہوں ؟

دوزخ ایسا ہو گا ؟

اور کیسا ہو گا ؟ بلکہ کبھی کبھی لگتا ہے میں عالم برزخ میں ہوں ۔ تب میں بہت خوفزدہ ہوتی ہوں ۔

تم خوفزدہ کیوں ہوتی ہو ؟

ہم سب ہوتے ہیں ۔ خوف کے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں خوف کے مکان میں رہتے ہیں اور خوف کے صحن میں یا خوف کی سڑک پہ سسک سسک کے دم توڑتے ہیں ۔ بس یہی ہے زندگی ۔ کبھی اپنا خوف کبھی کسی شے کا خوف ، کبھی خدا کا خوف ، کبھی خدا کے بندوں کا خوف ۔ کبھی زندگی کا خوف اور کبھی موت موت کا خوف !

اگر اتنے بہت سے خوف ہیں تو تم کیسے زندہ ہو ؟

بس عادت ہو جاتی ہے ۔

عادت کیسے ہو جاتی ہے ؟

جیسے سگریٹ کی چائے کی یا کافی کی عادت ہو جاتی ہے ویسے ہی انسانوں کی رشتوں کی اور خوف کی بھی عادت ہو جاتی ہے ۔

کیا موت بھی عادت بن سکتی ہے ؟

ہاں موت پہلے پہل تو نئی اور پراسرار دُنیا لگتی ہے جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ۔ اس سے ڈر بھی لگتا ہے مگر پھر آہستہ آہستہ بار بار مرنے کی عادت سی ہو جاتی ہے پھر مجبوری بن جاتی ہے لوگ بھی زبردستی یہ عادت ڈال دیتے ہیں ۔

لوگ کیسے عادت ڈال دیتے ہیں ؟

بار بار مارنے سے ۔ ہر مرتبہ نئے انداز سے نئے ہتھیار سے مارتے ہیں ۔ جب عادت ہو جائے تو انسان چیخنا چلّانا چھوڑ دیتا ہے ۔ احتجاج کرنا چھوڑ دیتا ہے ۔ جیسے ہمیں ظلم سہنے کی عادت ہو گئی ہے اب ہم ہر نئے ظلم کو بہت آسانی سے سہہ بھی لیتے ہیں ۔ بلکہ مسکرا کر ایک دوسرے سے نئے ظلم کا تعارف بھی کرواتے ہیں ۔

کیا ظلم کسی انسان کا نام ہے ؟

ظلم انسان کا نام بھی ہے ، کائنات کا بھی ، انسانی رویّوں کا بھی اور خُدا کا نام بھی ظُلم ہے ۔

مگر خُدا کو تو تم مہربان کہتی ہو ۔

وہ بھی کہتی ہوں جسطرح خونی رشتے مہربان ہوتے ہوئے بھی ظالم ہوتے ہیں ایسے ہی خُدا بھی ہے ۔ انسان چونکہ شروع ہی سے خُدا سے جھگڑتا آرہا ہے ۔ نادان بچّے کی طرح ضِد کرتا آرہا ہے سو ضِد میں آکر کبھی کبھی اُس کے نقشِ قدم پر چلنے کی اداکاری کر لیتا ہے ۔

خُدا تو نظر نہیں آتا پھر اُس کا نقشِ قدم کیسے ہو سکتا ہے ؟

دراصل خُدا کا نقشِ قدم ہم نے الہامی کتابوں میں کہیں کہیں دیکھا ہے ۔

کہاں اور کیسے دیکھا ہے ؟ لفظ تو بات سُنا سمجھا سکتے ہیں ، دکھا سکتے ہیں ۔ لفظ عکس بندی کے فن سے لاعلم ہیں ۔ انہوں نے تو اس کی تربیت بھی حاصل نہیں کی ۔

ہاں مگر کہیں کہیں ہم اپنے انداز سے اور قوتِ تخیّل سے کام لیتے ہوئے بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں ۔

مگر خدا نے تو پڑھنے کو کہا تھا اقراء پڑھ ۔

پڑھنے کو ضرور کہا تھا مگر بعد میں اُس نے حرف کو کیمرے کی آنکھ ہی دے دی ۔

کب دی ؟ میں نے تو نہیں دیکھا ؟

افوہ ! بھئی کبھی کبھی کچھ دیر کے لیے جب وہ نہایت مہربان ہوتا ہے تو انسان کو دنیا کا عجب نظارہ دکھاتا ہے ۔

کیسے ؟

تم نے کبھی کسی مجذوب سے حق سُنا ہے یا جب اُس کی رگ رگ سے صدا آتی ہے اور وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا ہے تو ہی تو گیت گاتا ہے ۔ توں رب میرا ، توں رب میرا پکارتا ہے ۔ پکارتا ہی چلا جاتا ہے ۔ اس کی سانس میں وہ رچ بس جاتا ہے اور بے خودی مستی کی خوشبو پھیل جاتی ہے تم نے کبھی منصور کا نام سُنا ہے ۔ اُس نے بھی تو خدائی کا دعویٰ کیا ہے اور ـــــ سرمد تو سولی چڑھا تھا اور کبھی کبھی تو اقبال کے کلام میں بھی خدا بولتا ہے اور ہاں یہ تمام صوفیاء اولیاء قلندر سبھی کی ریاضت اور عبادت نے من و تو کے بیچ فاصلہ ختم کر دیا اور تم نے گرو نانک میں بُدھا میں کیا اُس کا چہرہ نہیں دیکھا ؟

کس کا چہرہ ؟

وہی جو خود کو خالقِ حقیقی کہا ہے رحیم و کریم کہتا ہے ۔

تم کیا کہتی ہو ؟

میں کیا کہتی ہوں دیکھو کچھ لوگوں کے لیے وہ زندہ تھا ۔ رہے گا ۔ کسی کے لیے وہ کبھی کبھی نہیں ہوتا ۔ نہیں رہتا ۔

کیسے اور کن لوگوں کے لیے ؟

جن پر آزمائشیں آتی چلی جاتی ہیں جن کے امتحان کبھی ختم نہیں ہوتے ۔ کیا اُس ماں کے لیے خدا زندہ رہا جس کی جوان اولاد اُس کے سامنے قتل ہوئی یا جوان بیٹی کی آبرو لوٹی گئی ۔ کیا اُس عورت کے لیے خدا زندہ ہے جو برسوں سے بانجھ ہے یا بیاہ کی پہلی رات ہی طلاق کا جھومر لیے میکے کی دہلیز پہ لوٹ آئی ہو ۔ یا جو ساری عمر کنواری بیٹھی رہے ۔ جو بنا جرم سزا کاٹتے ہیں ۔ عُمر بھر کی سزا اُن کا خدا کہاں ہوتا ہے ، جس بچے نے یتیمی کی جھلستی دھوپ میں آنکھ کھولی خدا تو خدا ہے اُس کا باپ کیسے بن سکتا ہے ؟ کیا سہاگن چند دنوں میں بیوگی کی سفید چادر اوڑھ کر اُسے رحم کرنے والا اور نہایت مہربان کہہ سکتی ہے ـــــ وہ رحیم و کریم ہے مگر کن کے لیے غربت اور مفلسی میں گذرتی زندگیاں ، کیا وہ انسان زندہ رہتے ہیں ۔ جن کا اچھا وقت کبھی

نہ آیا ہو جن کے حصے کا لمحہ چرا لیا گیا ہو یا کھو گیا ہو، جو اپنی مرضی کی ایک سانس کے لیے ساری عمر ترستے رہیں اور قحط سالی چٹختی زمین ۔ اور بدن، کیا ان کے لب خدا کا ذکر کر سکتے ہیں؟ مگر ہاں اس کی مرضی ہے۔ جسے نوازے ۔ جس سے چھیننا چاہے سب کچھ چھین لے ۔ کیا ہر مرضی میں اُس کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی مرضی میں اس کی مرضی شامل نہیں ہوتی ۔

مگر جب وہ کہتا ہے کہ تم لوگ اُس کی مرضی پہ چلو تو تم انسان کیوں نہیں چلتے ؟

ہم تھک بھی تو جاتے ہیں ۔ ہمارا بھی جی چاہتا ہے کہ اُس کے پیچھے نہ چلیں ۔ اپنے پیچھے بھی چل کر دیکھیں

کوئی اپنے پیچھے کیسے چل سکتا ہے؟

چل تو نہیں سکتا مگر چلنے کی کوشش ضرور کرتا ہے ۔

کوشش ؟

ہاں کوشش ـــــ ۔ کوشش !

پھر تم خوش رہنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ؟

بہت مرتبہ کر چکی ہوں ۔ اب جان گئی ہوں کہ میں خوش نہیں رہ سکتی ۔ کبھی انسان راستہ روک لیتے ہیں کبھی خدا اور کبھی تو میں خود بھی اپنے راستے میں کھڑی ہو جاتی ہوں ۔

تم خود ؟ کیا تم بھی اپنی دشمن ہو ؟

ہاں میں بھی اپنی دشمن ہوں ۔ افسوس کہ میں بھی اپنی دشمن ہوں ۔ اپنی دشمن ۔ اپنی دشمن؟ آہ ! اپنی دشمن !

تلاش

تمہیں پتہ ہے میں برسوں سے بند گلیوں میں بھٹک رہی ہوں ۔
بند گلیوں میں کیوں ؟ بھٹکنا ہی ہے تو صحرا میں میدانوں میں بھٹکو ۔

ان گلیوں میں بھٹکنا صحراؤں میں بھٹکنے سے کم تکلیف دہ اور اذیت ناک نہیں ہے اب تو میرے پاؤں کے چھالے پھوٹ بہے اور ایڑھیاں پھٹ گئی ہیں ۔ لہو کی بوندیں سب گلیوں میں ہیں اور نشان چھوڑتی آتی ہوں ۔ پتہ ہے میں جہاں بھی جاتی ہوں راستے کھو جاتے ہیں ۔ ہر گلی آگے سے بند ہوتی ہے ۔ مجھے لوٹنا پڑتا ہے ۔ واپسی میرا مقدر ہے ۔ جس طرح بند گلی میرا نصیب ہے ۔

تمہیں بند گلی کا راستہ کس نے دکھایا ؟

اُس نے ـــــ !

کس نے ؟

وہی جس نے ایک مرتبہ دروازے پہ دستک دی تھی ۔ میں دروازہ کھولنے گئی دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا میں دروازے پہ ہاتھ کا لمس تلاش کرتے کرتے تھک گئی تو اُس کی تلاش میں نکلی اور ـــــ ان بند گلیوں میں سفر کرتے کرتے میری آنکھیں اندھی ہو گئیں ۔

تم واپس گھر کیوں نہیں چلی جاتیں ؟

میرا گھر کہاں ہے ؟ بس دوسروں کے مکانوں میں رہتے رہتے عمر گزار دی ۔ اسی اُمید پر کہ شاید کوئی مکان میرا گھر بن جائے ۔ میرا گھر ؟ مگر سب دوسروں کے گھر تھے تبھی چھین لئے گئے ۔

کیا تم جلاوطنی کی دھوپ تاپتی ہو ؟

جلاوطنی ! جلاوطنی تو اُسی کی ہوگی جس کا کوئی وطن ہوگا ۔ میرا تو کوئی وطن ہی نہیں ۔

کیا تمہارا کوئی وطن نہیں ؟

نہیں میرا کوئی وطن نہیں ، کوئی گھر نہیں ، کوئی زمین کا ٹکڑا نہیں اب تو ساری دُنیا کی زمین میرے لیے تنگ پڑ گئی ہے ۔ میں آسمان کو پکاروں گی ۔ اب اُسے نیچے اُترنا پڑے گا ۔ ورنہ میں کہاں جاؤں گی ۔ ؟

تم آسمان پر چلی جانا ۔

ہاں چلی تو جاؤں گی مگر فرشتے اور شیطان ، پریاں اور جن ، سورج ، چاند ، تارے ، آسمان پر بھی بہت ہجوم ہے وہاں بھی شاید مجھے جگہ نہ ملے ۔

پھر کہاں جاؤ گی ؟

کہاں جاؤں گی ؟ ممکن ہے سمندر کے پاس جاؤں ۔

سمندر ؟

ہاں وہ میرا دوست ہے ۔ پتہ ہے میں نے اُس سے بہت باتیں کی ہیں ۔ وہ میرے بارے میں جانتا بھی ہے ۔

ممکن ہے وہ میرا استقبال کرے ۔

مشکل ہے ۔

مشکل کیوں ؟

وہ تمہاری باتوں سے اُکتا چکا ہے ۔ تمہیں چاہیے تھا تم خاموش رہتیں تاکہ کچھ بھرم رہتا اور مشکل وقت میں تمہیں پناہ دے سکتا ہے ۔

پناہ ! پناہ تو اُسے دینا ہی ہوگی اور میں نے تمام باتیں خاموشی سے کی ہیں ۔

خاموشی سے ؟

ہاں وہ وہیں ریت میں چھپی بیٹھی تھی کبھی کبھی وہ سمندر کی لہر سے کوئی بات کر بھی دیتی ۔ کبھی پتھر کے سینے پر ہاتھ بھی رکھ دیتی کبھی ہوا کو بوسہ بھی دیتی اور کبھی مُسکرا کر دیکھتی ۔

کیا وہ مُسکرانا بھی جانتی ہے ؟

ہاں اُس کی مسکراہٹ تو بہت دلفریب ہے ۔ تم دیکھو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ـــــ مگر تم کہاں دیکھو گی ؟ وہ بہت کم لوگوں سے مسکرا کر بات کرتی ہے ۔ عموماً تو سنجیدہ ہی رہتی ہے ۔ کبھی کبھی قہقہہ بھی سُننے کو ملتا ہے مگر بہت کم ، بہت ہی کم ،

خاموشی دیکھنے میں کیسی ہے ؟

نہایت خوبصورت ، بہت پُروقار ، سلجھی ہوئی ۔

کیا واقعی تم سچ کہہ رہی ہو ؟

ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں مگر ایک مسئلہ ہے ۔

مسئلہ ـــ کیسا مسئلہ ؟

وہ اکثر اُداس رہتی ہے ۔ بہت زود رنج اور حساس ہے ۔ لگتا ہے وقت نے اُسے ۔ بہت تنگ کیا ہے ۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی ۔ شائد وقت نے اُسے بہت دُکھ دیئے ہیں ۔ اُس نے کبھی ذکر نہیں کیا مگر محسوس مجھے ہوتا ہے ۔ بس وہ اپنی جان پہ جھیلتی ہے ۔ صبر تو کوئی اُس سے سیکھے ۔

کس سے ؟ خاموشی سے ، تم اُس کی اتنی تعریفیں کیوں کرتی ہو ؟

وہ میری بہت اچھی گہری دوست ہے ؟

کیا مجھ سے زیادہ اچھی اور گہری دوست ؟

پتہ نہیں یہ کبھی نہیں سوچا ۔

کیوں نہیں سوچا ؟

تم سوال بہت کرتی ہو ہر وقت مجھے کُریدنے کی کوشش کرتی رہتی ہو ۔ آخر تم میرے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو ؟ کیوں ہر وقت سوال کرتی رہتی ہو ؟ مجھے سوالوں سے نفرت ہے کیا تمہیں یہ بات یاد نہیں رہتی ۔ آخر تم کیوں بھول جاتی ہو کہ میں سوالوں کے جواب زیادہ دیر تک نہیں دے سکتی ۔ اب میں تھک گئی ہوں ۔ تم مجھے سونے دو ۔

تمہیں نیند بھی آتی ہے ؟

ہاں کبھی کبھی ۔ زیادہ وقت تو نیند کی خواہش میں ہی گزر جاتا ہے ۔ جب نیند آتی ہے تو چاہتی ہوں کہ بس جلدی سے سو جاؤں ۔

کیا تم خوابوں کی خواہش میں ہوتی ہو ۔

کیا تم خوابوں کی خواہش میں سوتی ہو؟

نہیں سُکھ اور سکون کی خواہش میں۔

تم اتنی مضطرب اور بے چین کیوں رہتی ہو؟

بس مضطرب بنایا میری کتاب میں لکھا گیا ہے۔

کتاب۔ کونسی کتاب؟

وہی جو سب سے بڑے کاتب نے سب سے بڑے لکھنے والے نے لکھی ہے۔ جس کے قلم میں بڑی طاقت ہے۔ جس کے قلم میں زندگی اور موت ہے۔ موت کا دروازہ جو گہری اور طویل نیند کی سمت کھلتا ہے۔ نیند جو بڑی نعمت ہے۔ بس اب تم چُپ کر جاؤ اور مجھے سونے دو۔

کیا تم اکیلی سوتی ہو؟

سب اکیلے ہی سوتے ہیں۔ ہاں جاگتے ہوئے۔ بہت سے لوگ مل کر جاگتے ہیں۔

کیا سب لوگ؟

نہیں چند لوگ۔ ورنہ؟

ورنہ کیا؟

کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں میرے ساتھ رہتے ہوئے۔ ابھی تک تم نہیں جان پائیں کب جاؤ گی؟ کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے بلکہ کچھ سوال بھی ضروری نہیں ہوتے۔

کیوں؟

اس لیے کہ اُن کے جوابات کا علم ہمیں پہلے سے ہوتا ہے۔ پھر سوال کرنے کا فائدہ؟

تم فائدے نقصان کے چکر میں کب سے پڑ گئیں؟

شاید پہلے دن سے، شاید اب سے۔ پتہ نہیں کب سے؟ مگر تم اسوقت رات کے آخری پہر مجھ سے سوال کیوں کر رہی ہو؟ جانتی ہو کہ یہ وقت آنکھوں میں نیند کی سلائی بھرنے کا ہے۔

کیا نیند کا رنگ سیاہ ہے؟

ہاں نیند کا رنگ بھی سیاہ ہے۔ گہرا، وسیع، بامعنی، مکمل۔

تبھی تم نے نیند کی سلائی کہا جیسے نیند کاجل ہو۔

ہاں نیند بھی کاجل کی طرح ہے۔ چھوڑو ان باتوں کو مجھے سونے دو۔ تم بھی میری دوست نہیں ہو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ یہ وقت ——— یہ وقت تو . . . . . .

نہیں میں تمہاری دوست تو ہوں اور وقت تمہارے سونے کا ہو یا جاگنے کا تمہیں میری ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ میں ہی تو ہوں جو تم سے سوالوں کے ذریعے بات چیت کر لیتی ہوں۔ تم کسی اور سے اتنی باتیں کرو تب مانوں۔ ارے۔ لو۔ تم نے تو آنکھیں بند کر لیں۔ سو گئی ہو؟

آنکھیں بند کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نیند بھی آ گئی۔ میں سو بھی جاؤں تو جاگتی ہی رہوں گی۔ مگر تم اب سو جاؤ۔ صبح ہونے کو ہے۔ باقی باتیں ہم پھر کریں گے۔

پھر کب؟

صبح ——— صبح ہاں اگر میں دوبارہ زندہ کی گئی تو صبح ضرور آئے گی۔ صبح کو آنا چاہیے۔ صبح کو آنا ہی ہوگا۔ صبح کو آنا ہی ہوگا۔

رقصِ مجذوب

یہ جنگ کیوں ہوتی ہے ؟

جنگ ۔ بس ہو جاتی ہے ۔

ہو جاتی ہے مگر کیوں اور کیسے ؟

دراصل انسان کو اپنا لہو بہت عزیز ہوتا ہے اسی لیے وہ دوسروں کو لہولہان کرتا ہے ۔

جنگ میں کیا صرف انسان لہولہان ہوتے ہیں ؟

ہاں انسان بھی ، حیوان ، بدن ، روحیں سبھی لہولہان ہوتے ہیں ۔

سب سے زیادہ ظلم کس پر ہوتا ہے ؟

ظلم ۔ جنگ میں سب سے زیادہ ظلم تو عورت پر ہوتا ہے اور اس زمین پر جو جرم کئے بغیر لہو کی قید گزارتی ہے ۔ بغیر خواہش کے اس کے بدن کو استعمال کیا جاتا ہے ۔ عورت کی طرح ——————

لیکن ظلم عورت پر ہی کیوں ہوتا ہے ؟

کیونکہ وہی سب سے سستی اور مہنگی شے ہے ۔ اُس کی مانگ تو ہر دور میں رہی ہے ۔ مرد کی حیوانیت جاگتی ہے ۔ مرد کا وجود عورت کی طرف بڑھتا ہے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے ۔ جس کے نتیجے میں عورت کا پیٹ بڑھ جاتا ہے اور پھر ناجائز اولاد ۔

یہ ناجائز اولاد کیا ہوتی ہے ؟

ناجائز اولاد کیا ہوتی ہے ؟ بس سبھی ناجائز اولادیں ہوتی ہیں اور سبھی جائز بھی ۔ جب اپنی مرضی سے والدین کسی بھیڑیے کے ہاتھوں میں اپنی بیٹی دیتے ہیں تو اُن کی اولاد جائز ہو جاتی ہے ۔ چند حرف پڑھ دینے سے عورت کے بدن پر ہاتھ مضبوط اور طاقت جائز سمجھی جاتی ہے ۔

سُنو! اگر کوئی اپنی مرضی سے کسی شخص کو اپنا آپ سونپ دے تو اُس کی اولاد ناجائز کہلاتی ہے کیوں؟ جبکہ عمل اور ردِ عمل ایک سا ہوتا ہے پھر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

تم نہیں سمجھو گی ان باتوں کو ، یہ دنیا والوں کی باتیں ہیں اُن کے مطابق جو جائز اولاد ہے کیا وہ اس وقت بھی جائز رہتی ہے جب ـــــ جب ؟ جب والدین کے ہوتے ہوئے وہ یتیموں جیسی زندگی گزارنے پہ مجبور ہو ۔ جب کوئی چھت اسے سہارا نہ دے تب یہ تو بس یونہی کہنے کی باتیں ہیں ۔ تمہیں پتہ ہے مجھے انسانوں سے شدید نفرت ہے ۔

نفرت کیوں ؟

کیا انسان جس طرح ایک دوسرے کو اذیت پہنچاتے ہیں یہ قابلِ محبت بات ہے ؟

شائد نہیں مگر ہر انسان اپنے حق کے لیے دوسرے کو دُکھ پہنچاتا ہے ۔

ہاں اسی لیے کچھ لوگوں کے حق کہیں نہیں ہوتے ۔ اُن کی زندگی کی کتاب میں تو صرف فرائض لکھے گئے ہیں ۔ حقوق نہیں حقوق دوسروں کے لیے اور فرض اُن کے لیے یہ تضاد کیوں ہے ۔ آخر کیوں؟

تم جھگڑتی کیوں ہو ۔ ناراض کیوں ہوتی ہو ؟

میں جھگڑا نہ کروں ناراض نہ ہوں تو کیا کروں ؟ کیا میں اپنا کوئی درد بھی بیان نہیں کر سکتی کیا صرف دوسروں کے دُکھ سُنتی رہوں ، دوسروں کو تسلی دیتی رہوں ، دوسروں کے سر پہ ہاتھ رکھتی رہوں ، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے میرے کاندھے دُکھنے لگے ہیں ۔ میں تھکن سے چُور وجود لئے کہاں جاؤں ، کہاں؟ میرے لیے تو کوئی بھی جگہ نہیں ہے ۔

لیکن جہاں جہاں تم جاتی ہو ، جن لوگوں کے پاس ، کیا وہ بھی پناہ نہ دیں گے ؟

ہاں پناہ دیں گے ۔ مگر کچھ عرصے کے لیے جب تک اُن کی آنکھوں میں اپنے آنسو ہوں گے ، وہ سب تو مجھے اپنے لیے بلاتے ہیں مجھے میری خاطر کون پکارتا ہے ۔ کوئی بھی نہیں ۔

کیا کوئی بھی نہیں اور جو تمہارے راستوں میں آتے ہیں وہ ؟

وہ سب اپنے لیے آتے ہیں ، میرے لیے نہیں ، میرے لیے تو کبھی بھی کوئی نہیں آیا ، ایک

مرتبہ میں نے سمجھا کہ وہ میرے لیے آیا ہے، مگر وہ بھی اپنی خاطر آیا تھا، سب اپنے لیے آتے ہیں۔

سب اپنے لیے آتے ہیں؟ تم کیوں سمجھتی ہو کہ کوئی تمہارے لیے آئے گا۔

بس جی چاہتا ہے کہ کوئی تو آئے ——— کوئی تو آئے!

آنے والوں کو تو تم خود جھٹک دیتی ہو۔

میں کب جھٹکتی ہوں، میں تو ابھی اُن کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پاتی کہ وہ دوسرے لوگ بلکہ وہ سبھی لوگ انہیں جھٹک دیتے ہیں۔

اگر تم دوبارہ کبھی انہیں دیکھو گی تو کیا پہچان لو گی؟

ہاں پہچان لوں گی۔

مگر کیسے پہچانو گی؟

ان سب کے سینے میں داغ ہوگا، گہرا سیاہ داغ، جُدائی اور دُکھ کا داغ

کیا تم انسانوں کے دلوں میں جھانک سکتی ہو؟

ہاں میں انسانوں کو بہت دُور تک جان لیتی ہوں۔

کیا تم انسانوں کے دلوں میں جھانک سکتی ہو؟

کیا تم خُدا ہو؟

نہیں۔ خُدا نہیں خدا جیسی ہوں۔

وہ کیسے؟

دیکھو ناں کتنے انسان ہیں جو میرے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر .....

مگر کیا .....؟

مگر خُدا تو آنسو نہیں بہاتا۔

بہاتا ہے اپنے اندر بھی اپنے باہر بھی ...

کیا خُدا روتا ہے؟

ہاں، ممکن ہے روتا ہو مگر شاید چیختا نہیں ہوگا۔

اگر خُدا نہیں چیختا تو تم اُس روز کیوں چیخی تھیں۔

میں چیخی تھی کب، کس کے سامنے؟

اُن چند لوگوں کے سامنے جو تمہارے بہت قریب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور تمہیں جانتے ہیں
دعویٰ تو ہر شخص آسانی سے کر سکتا ہے اور رہی بات جاننے کی تو یقین جانو مجھے کوئی بھی نہیں جانتا ۔

کوئی بھی نہیں جانتا ؟

ہاں کوئی بھی مکمل طور پہ نہیں جانتا ۔

مگر تمہارے بارے میں کوئی تو کچھ جانتا ہوگا ۔

ہاں کچھ جاننے اور بہت کچھ جاننے میں بہت فرق ہوتا ہے ۔ بہت واضح فرق ۔ وہ لوگ میرے بارے میں کچھ ضرور جانتے ہیں ۔ بہت کچھ نہیں جانتے ۔ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا جاننا اُن کے لیے میں ضروری سمجھتی ہوں جتنا میں انہیں اپنے بارے میں بتاتی ہوں ۔

تم اپنے بارے میں سب کچھ نہیں بتاتیں ۔ ؟

اس لیے نہیں کہ میں بتانا نہیں چاہتی اور اس لیے بھی نہیں کہ انہیں بتانے یا نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

اچھا اس بحث کو چھوڑو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم اُس دن کیوں رو رہی تھیں ؟ اور اتنا کیوں چیخی تھیں ؟ ۔

میں کسی ایک بات پر کب روتی ہوں ، میں تو ایک وقت میں ہزاروں لاکھوں باتوں پر روتی ہوں ۔

کب ؟

جب میں ہنستی ہوں اور جب میں مسکراتی ہوں جب لکھتی ہوں جب پڑھتی ہوں بس ہزار مرتبہ لاکھوں مرتبہ ، کروڑوں مرتبہ ——— !

کیا جب تم گیت گاتی ہو تب بھی ، جب تصویر بناتی ہو تو ؟

ہاں تب بھی ، تب بھی میں رو رہی ہوتی ہوں ۔

جب رقص کرتی ہو کیا تم اس وقت بھی رو رہی ہوتی ہو ۔

ہاں میں دیوانگی کی حد تک روتی ہوں اور کیا تم مانو گی کہ میں یہاں پر بیٹھی اپنے اندر رقص مجذوب میں مصروف ہوتی ہوں ۔

لیکن وہ تو خاص انداز سے خاص ماحول میں ہی کیا جاتا ہے ۔

نہیں وہ ہر ماحول میں کیا جا سکتا ہے ۔ اور . . . . . .

سُنا ہے اُس رقص کے دوران اکثر انسانوں کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے ۔

ہاں میں بھی لمحہ لمحہ موت کا چہرہ دیکھتی ہوں ۔ تمہیں بتاؤں کہ موت میرے اندر باہر زندہ ہے ،

میرے آس پاس، میرے اردگرد۔

تم بات بدل دیتی ہو؟

ہاں میں بات بھی بدل دیتی ہوں مگر تم کیوں بھول جاتی ہو کہ میں مرتی رہتی ہوں؟ مرتی رہتی ہوں، مرتی رہتی ہوں۔

تم اُس روز کیوں چیخی تھیں؟

کیوں چیخی تھی؟ اس لیے کہ چیخنا بھی ضرورت تھی پتہ ہے اُس روز میں پہلی مرتبہ اپنے باہر چیخی تھی، پہلی مرتبہ اور اُس کے بعد میں اپنے اندر چھپ گئی تھی، اپنی ذات میں، میں خُدا نہیں ہوں خُدا جیسی ہوں، تنہا ہوں۔ اُداس ہوں۔ جانے کیا کیا ہوں؟

تم خُدا جیسی ہو تو کیا تم قہار و جبار بھی ہو؟

ہاں مگر خود پہ ہی قہر ڈھاتی ہوں، اپنی جان پہ جبر کرتی ہوں اپنی ہی ذات پہ رحم کھاتی ہوں۔

کیا تم میں تمام خدائی صفات ہیں؟

تمام تو نہیں مگر بہت سی ہیں۔

کیا تم انسانوں کو زندہ اور مُردہ کر سکتی ہو؟

ہاں میرے بعض فیصلوں پہ بعض جملوں پہ انسان زندگی پاتے ہیں اور کبھی کبھی تو مر بھی جاتے ہیں۔

کیا تم سچ کہتی ہو؟

ہاں ہمیشہ سچ کہتی ہوں میں جھوٹ اور منافقت سے نفرت کرتی ہوں، ان بُری عادتوں سے پرہیز کرتی ہوں بلکہ ان بُری چیزوں کو عادت بنانے سے میں نے ہمیشہ احتراز کیا ہے اگر یہ باتیں میری عادتوں میں شامل ہو جاتیں تو ——— تو؟ آج میں تم سے اس طرح بات نہ کر رہی ہوتی۔

تم اس طرح سے بات کیوں نہ کرتیں؟ میں نے تو ہمیشہ جھوٹے اور منافق لوگوں کو بہت اچھی گفتگو کرتے سُنا ہے۔

ضرور سُنا ہو گا مگر اچھی اور سچی گفتگو میں فرق ہوتا ہے، درمیان میں ایک دیوار ہوتی ہے۔

ہونہہ! مگر ایسی دیواریں لوگوں کو نظر کہاں آتی ہیں؟

نہیں نظر آتیں انہیں جو دیکھنا نہیں چاہتے جو دیکھنا چاہیں جو اس کی ضرورت محسوس کریں انہیں یہ تو کیا اس سے بہت باریک دیواریں بھی نظر نہیں آتیں۔

تم دیواریں دیکھتی ہو۔

ہاں دیکھتی ہوں اور ان اونچی اونچی دیواروں میں دم میرا گھٹتا ہے، میرا دم گھٹتا ہے، میرا دم گھٹتا ہے اور گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

تمہارا دم تو اکثر گھٹتا ہے یہ بات کیوں کہتی ہو؟

میں یہ بات اس لیے کہتی ہوں کہ تم اس کو نہیں جانتی ہو، تمہیں کیا خبر کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ میرا دم گھٹتا ہے تو کیوں کہتا ہے؟ تمہیں کیا خبر ——— تم کیا جانو؟ کس کس طرح دم گھٹتا ہے اور کیا محسوس ہوتا ہے؟ ہائے میری سانس رکتی ہے اکھڑ رہی ہے سانس ہائے! کوئی نہیں جانتا، کسی کو بھی معلوم نہیں کہ دم کیوں گھٹتا ہے!

تم بتاؤ ناں

نہیں میں کیوں بتاؤں اور کیسے؟ آخر کیوں؟ سب جانتے ہیں اور نہیں جانتے، سب سمجھتے ہیں اور نہیں سمجھتے کیوں کہ سمجھنا نہیں چاہتے اور میں تمام باتیں نہیں بتاتی، اگر کبھی کسی شخص کو میرے دکھ کی شدت کا اندازہ ہو جائے۔ علم ہو کہ میرے عذاب کتنے ہیں، اذیت کس طرح میری جان سے گزرتی ہے تو یہ بات کوئی چھاتی برداشت نہ کر سکے گی اور پھر ——— پھر تم سب کا دم گھٹنے لگے گا، تم سب بھی مر جاؤ گے تب ہر طرف موت پھیل جائے گی۔

تمہیں تو موت اچھی لگتی ہے پھر دوسروں کی موت پہ غمگین کیوں ہوتی ہو؟

اس لیے کہ میں موت کی اذیت سے واقف ہوں، میں نے لاکھوں موتیں جھیلی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ کوئی دوسرا انسان بھی اسی عمل سے گزرے۔

لیکن بھئی میں داخل ہونے والا تو کندن بن کے نکلتا ہے پھر تم ..... کیا تم خود غرض ہو؟

ہاں میں ہمیشہ دوسروں کو دکھ سے بچاتی آئی ہوں۔ خدا نہ کرے کوئی اور بھی انہی راستوں سے گزرے جن سے گزر کے میں آئی ہوں، کھائیوں میں گرتے گرتے تھک گئی ہوں۔ پہلے پہل میں کھائی میں گر جاتی تھی پھر پتہ چلتا تھا کہ ڈھے گئی ہوں اب گرنے سے پہلے ہی دور سے دیکھ کے نشانات لگا لیتی ہوں کہ کس کس مقام پر کھائی ہے۔

تم شعور کی دولت پا کر خوش نہیں ہوئی کیوں؟

بس بہت کچھ دیکھ لیا ہے جان لیا ہے اتنا کہ اب آنکھیں بند کر لینے کو جی چاہتا ہے، میری تو آنکھیں بھی احتجاج کرنے لگی ہیں، اتنے سرخ مناظر دیکھے ہیں کہ اب میری آنکھیں بھی سرخ رنگ کی ہو گئی ہیں۔

تمہاری آنکھیں تو شائد کالے یا بھورے رنگ کی ہیں۔

ہاں دوسروں کو یہی رنگ نظر آتے ہیں مگر مجھے تو اپنا سارا وجود سرخ رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے

اور میں اپنے دیکھے کو ہی سچ مانتی ہوں ۔ سچ کہتی ہوں ۔
کبھی کبھی تو دیکھا سُنا بھی غلط ہو جاتا ہے ۔

ہاں کبھی کبھی ، مگر جب دیکھا سُنا صحیح ہو جاتے تو میرا دم گھٹتا ہے ۔ اپنے آپ سے میلوں دُور بھاگنے کو جی چاہتا ہے اور جب کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو میرا دم گھٹتا ہے بہت شدت سے دم گھٹتا ہے ——— دم گھٹتا ہے !

نیا جنم

تم سگریٹ پیتی ہو؟

ہاں۔

کیوں؟

اس کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ بس اس لیے پیتی ہوں کہ پینا چاہتی ہوں۔

اگر کل تم شراب پینا چاہو گی تو وہ بھی پیو گی کیا؟

پتہ نہیں میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی، میرا خیال ہے شراب میں دوسروں کے لیے پسند کر سکتی ہوں۔ مگر اپنے لیے بالکل نہیں۔

کیوں؟

دراصل ہمارے ذہنوں میں شروع دن سے ہی کچھ چیزوں سے نفرت کا بیج بویا جاتا ہے، شراب بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ انسان برائی نہ کرے۔

کیا یہ ضروری ہے کہ آپ شراب پیئے بغیر بھی نیک ہوں گے؟

نہیں یہ ضروری نہیں مگر یہ فرض کر لیا ہے۔ مجھے فرض کئے جانے والے واقعات اور سوالوں سے شدید نفرت ہے۔ کتنی زہریلی باتیں ہیں جو ہم فرض کرنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔

جو باتیں یقینی ہوتی ہیں انہیں ہم بھول جاتے ہیں ۔ ان سے ہم نظریں چُرا کر چلتے ہیں کیوں ؟
کیونکہ ہم نے ان سے ادھار لیا ہوتا ہے ۔ زندگی سے سچ کا اُدھار جو ہم کبھی نہیں چُکا پاتے ۔
یہ لوگ اُدھار کیوں لیتے ہیں ؟
اس لیے کہ اُن کے پاس اپنی ضرورت کی چیزیں کم ہوتی ہیں ۔
کیا علم اُدھار لیا جا سکتا ہے ؟
ہاں کتابوں سے
اور عمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟
عمل بزرگوں سے ، وقت سے ۔
اور کیا مذہب ؟
مذہب ہم اُدھار لیے بغیر ہی منافع پہ بیچتے رہتے ہیں ۔
کیسے ؟
کیا تم اندھی ہو ، تم نہیں دیکھتیں کہ ہم نے کس طرح کتنے سستے داموں خُدا کی خرید و فروخت شروع کر رکھی ہے اور ہم نے تاریخ جھٹلا دی ہے اور ہم نے شرم بیچ کھائی ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم اب تمام پرانی باتوں اور اچھی قدروں سے علیحدہ ہو گئے ہیں ہم نے اپنی ذات کی نفی کرنی شروع کر دی ہے وہ تو شائد ہم ہمیشہ سے کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ اور کرتے رہیں گے ہم چیزوں کے بارے میں پُر اعتماد نہیں ہوتے بے یقینی کی کیفیت میں زندگی گذارتے ہیں ۔ ہم اپنی ذات میں با اعتماد نہیں رہے ، ہم نے اپنے بھی ٹکڑے کرنے شروع کر دیئے ہیں ۔ اور دوسروں کی جان کے بھی دشمن ہوئے پھرتے ہیں ۔
تمہاری کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں مثلاً یہ کہ تم کہتی ہو تمہیں دُھرائی جانے والی باتوں سے نفرت ہے اور تم خود کئی باتیں برسوں سے دُھرا رہی ہو ۔
ہاں ! جب لوگ ایک مرتبہ نہیں سمجھتے تو باتیں دہرانا پڑتی ہیں ، اُن کا دھرانا ہی ضروری ہوتا ہے ۔
اگر تم تاریخ نہیں ہو تو خود کو دُھراتی کیوں ہو ؟
میں کبھی تو مکمل تاریخ ہوتی ہوں اور کبھی تاریخ کے کسی باب کا پھٹا ہوا ورق ، مجھے دوسرے حصوں سے خود کو ملانے اور جوڑنے کے لیے پکارنا ہی پڑتا ہے ۔ کیا تم پکار سمجھتی ہو ؟
نہیں ۔
ہاں تم واقعی پکار کی رُوح سے واقف نہیں ہو جب اندر باہر پکارنے لگتا ہے تو کیا ہوتا ہے ؟

کیا تم یہ بات تصوف کے حوالے سے کر رہی ہو؟

ہاں تصوف کے حوالے سے بھی، دُکھ اذیت کے حوالے سے بھی، خود شناسی کے حوالے سے بھی۔ ایک بات غور سے سُنو! میں جب بھی کوئی بات کہتی ہوں تو اُس ایک بات میں کئی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ میری ہر بات کے ہزار معنی ہیں۔

ہونہہ! جبھی تم دوسروں کی کہی اور ان کہی باتیں بہت آسانی سے سمجھ لیتی ہو۔

ہاں سمجھ لیتی ہوں۔ جان جاتی ہوں دراصل یہ شعور ہی انسان کی موت کا باعث بنتا ہے۔

وہ کیسے؟

شعور انسان کو نیک و بد کی پہچان دیتا ہے۔ ایک نئی دُنیا دریافت ہوتی ہے، تب پُرانی دُنیا سے رشتے ٹوٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان آگے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ جہاں پہ تنہائی بدن کا حصّہ بن جاتی ہے۔ منفرد ہونا، علیحدہ ہونا خوبصورت بات ہے پختہ تجربہ ہے، زندہ حقیقت ہے، صرف دیکھنے کی حد تک تم ابھی نادان ہو۔ اس لیے منفرد ہونے کے دُکھ سے واقف نہیں ہو، کرب سے واقف نہیں۔ جب ہجوم میں رہ کر انسان تنہا رہ جاتا ہے، ہجوم سے کہیں دُور بہت دُور نکل جاتا ہے۔ تب کیا ہوتا ہے؟

کیا ہوتا ہے؟

بہت کچھ ہوتا ہے اور ایک سطح پہ کچھ بھی نہیں ہوتا، کسی بھی بات سے کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور کہیں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ کسی انسان کے لیے دوسرے انسان سے جُدا ہو جانا ہی زندگی ختم ہو جاتی ہے وہ خود ہی زندگی کا دروازہ بند کر دیتا ہے اور موت اس کے لیے اپنا دروازہ کھول دیتی ہے، کسی شخص کے لیے سب سے جُدا ہو جانا ایک نیا جنم ہوتا ہے۔

یہ نیا جنم کیا ہوتا ہے؟

تم نے فروغ فرخزاد کو نہیں پڑھا ہے تبھی تم تولدِ دیگر سے شناسا نہیں ہو۔ یہ نیا جنم یا تولدِ دیگر یعنی REBIRTH بہت ضروری ہے۔

تم نے تو شاید ہزاروں لاکھوں مرتبہ نیا جنم لیا ہے۔

ٹھیک کہا تم نے دراصل یہ دوسری زندگی بہت ضروری ہوتی ہے۔

کیوں؟

یا تو انسان اس تجربے سے مکمل ٹوٹ جائے یا اُس کی تکمیل ہو جائے۔ اگر مکمل ہو جائے تو خوب اگر

پوری طرح سے بکھر جائے تب ذات کو سمیٹنا اور نئے سرے سے اپنی تعمیر کرنا اس کے لیے قدرے آسان ہوگا۔ جبکہ آدھے بکھرے آدھے سمٹے وجود کو یکجا کرنا بہت دُشوار ہوگا۔ بہت ہی دشوار!

تم مشکل باتیں کرتی ہو۔

نہیں یہ تو آسان ترین باتیں ہیں جو میں تم سے کرتی ہوں تاکہ انہیں سمجھ سکو۔

کبھی کبھی تو لگتا ہے۔ جیسے تم مجھ سے نہیں خود سے باتیں کر رہی ہو۔

ہاں! کبھی کبھی تو میں واقعی تم سے بہت دُور نکل جاتی ہوں بس اپنے اندر کہیں چھپ جاتی ہوں جہاں سے واپس آنے میں، جہاں سے نکلنے میں وقت لگتا ہے۔ بہت مشکل سے میں اپنی دُنیا سے باہر نکل کر تمہاری دُنیا میں داخل ہوتی ہوں۔

لیکن تم مشکلیں جھیلتی رہتی ہو بلکہ دوسروں کی مشکلیں حل کرتی ہو۔

ہاں! جو دوسروں کی مشکلیں حل کرتا ہو وہ اپنی مشکلیں حل نہیں کر سکتا۔

کیا اُس کے لیے کسی اور کو آنا پڑتا ہے؟

ہاں اس کے لیے کسی اور کو ہی آنا پڑتا ہے۔

تم ہر ایک کا دُکھ اپنی چھاتی پر جھیلتی ہو مگر تمہارا غم کون کرے گا؟

میرے غم کون کرے گا؟ میرا غم کون کرے گا؟ پتہ نہیں، شائد میرا غم کرنے کے لیے کوئی کبھی آجائے شائد کبھی نہ آئے۔ میرا غم اٹھانے والا مجھ سے بڑا ہونا چاہیے بہت بڑا جو مجھے اور میرے بچوں کو پناہ دے سکے۔ جو اس دھرتی جتنا، سمندروں جتنا، پہاڑوں جتنا حوصلہ رکھتا ہو۔ مگر ایسے انسان کہاں ہوتے ہیں؟

ہوتے ہیں (سرگوشی) ہوتے ہیں۔ ہاں تمہارے لیے تو کوئی تم سے بڑا خُدا جیسا ہونا چاہیئے۔

ہاں۔ ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ اُسے مجھ سے بڑا ہی بننا پڑے گا۔ مجھ سے چھوٹے تو ہزاروں لاکھوں میرے گرد بکھرے پڑے ہیں۔ مگر مجھے ان کی ضرورت نہیں مجھے خُود سے چھوٹوں کی نہیں کسی اپنے جیسے کی یا پھر کسی خود سے بڑے خُدا کی ضرورت ہے ـــــ مجھے کسی اور کا انتظار ہے۔ اِن میں سے تو کوئی بھی نہیں جسے میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ جسے میں سوچنا چاہتی ہوں جسے میں ماننا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ کوئی اور ہوگا۔ کہیں اور ہوگا مگر وہ یہاں کہیں نہیں ہے۔ وہ یہاں نہیں ہے!

سنو! کبھی کبھی لگتا ہے جیسے یہ تم نہیں ہو کوئی اور ہی ہے بہت بڑی روح جو عام انسانی روح سے ماورا ہے۔

تم ٹھیک کہتی ہو کبھی کبھی تو مجھے بھی اپنے ہونے پہ حیرت ہوتی ہے ایک عام انسان یا عورت...؟
عام عورت تو انسانوں کو اتنا سکھ نہیں دے سکتی۔ تم عام عورت تو نہیں ہو۔
ہاں نہیں ہوں مگر وہ یہ بات نہیں مانیں گے۔ تم اُن کے سامنے ایسی بات مت کہنا۔
کیوں؟ میں ان سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ ضرور کہوں گی کہ تم ایک عام عورت نہیں ہو۔ بہت خاص عورت ہو۔ بہت اہم عورت ہو۔
اچھا! (قہقہہ)
ہاں اور تمہارا نام کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟
معنی۔ نام؟ دوسروں کو زندگی دینے والی، شریک سفر۔۔۔۔
یہ تو اسم بامسمّٰی ہے۔ واقعی تم اپنے لیے کہاں زندہ ہو۔ دوسروں کے لیے ہو۔
یہ سکھ اور دکھ بات ہے کہ میں دوسروں کے لیے زندہ ہوں صرف دوسروں کے لیے۔ میری اپنی زندگی کیا ہوئی؟
میرے حصّے کا لمحہ کب آئے گا؟ آئے گا بھی کہ نہیں ـــــ کہیں آگے گذر تو نہیں گیا میرے حصّے کا لمحہ۔ کوئی ایک لمحہ۔ میرا لمحہ۔ میرا لمحہ۔ میرا لمحہ کیوں ہے؟ میرا لمحہ کہاں ہے؟ کہاں ہے، کہاں ہے؟ اس جملے کی بازگشت ساری کائنات میں پھیل گئی اور ہر طرف سوال، سوالیہ نشان گھومنے لگے۔ کسی نے انہیں آوارگی کا الزام نہیں دیا؟ انہیں گھر سے نکل جانے کا حکم نہیں دیا؟ کیا ان سوالوں اور سوالیہ نشانات کے والدین مر گئے ہیں جو انہیں عاق کر دیتے؟ کیا انہیں روکنے والا کوئی نہیں؟ کوئی سُرخ بتی ان کا راستہ نہیں روکتی کوئی وردی والا ان کا چالان نہیں کرتا؟ ان کو تحفظ کیوں دیا گیا؟ ان کے لیے جیل کی اونچی دیواریں کیوں نہیں بنائی گئیں؟ ان کو تحفظ کیوں دیا گیا؟ ان کے لیے کچھ کیوں نہیں کیا گیا؟ آخر کیوں سب ان کے خیر خواہ ہیں؟
آخر کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ ؟ ؟ ؟ ؟

بے انت سفر

سنو!

ہونہہ ؟

پہلے زمانے میں لڑکیوں کو دفن کیوں کرتے تھے ؟

پہلے زمانے میں دفن کرتے تھے تو نظر آجاتی تھیں آج تو بنا مرگ کے دفنائی جاتی ہیں نظر بھی نہیں آتیں ۔

جیسے چتا میں زندہ جلائی جاتی تھیں ؟

ہاں ! ویسے بھی مگر اب ہر لمحہ زندہ زمین میں گاڑ دی جاتی ہیں ۔

کیا تمام لڑکیاں ؟

نہیں کچھ لڑکیاں ۔

تم خود تمام میں شامل ہو یا کچھ میں ؟

میں بدقسمتی اور خوش قسمتی سے کچھ میں شامل ہوں

خوش قسمتی کیسے ؟

بس تم نہیں سمجھو گی ۔

تم سمجھاؤ ناں ؟

نہیں ۔ ابھی میں سمجھانا نہیں چاہتی ۔

تم اس وقت کچھ اور سوچ رہی ہو شائد . . . . . .

ہاں ۔

کیا ؟

اُس کل والی لڑکی کے بارے میں سوچ رہی ہوں ۔

کون ؟

وہ میری ہم نام تھی ، اس میں کچھ تھا ، جو مجھ جیسا تھا ۔

مثلاً ؟

مثلاً ذہن ، وہ مجھے کھوج رہی تھی ۔

کھوج رہی تھی —— کیسے ؟

سوالوں سے ۔

سوالوں سے ؟

ہاں تم نے نہیں سُنا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ تم کیسی ہو ؟ کیا ایسی ہی ہو جیسی نظر آتی ہو ۔ میں نے کہا تھا ہاں ایسی ہی ہوں ۔ ایسی ہی نہیں ہوں ۔

کیا مطلب ؟

مطلب یہ کہ جتنی بظاہر زندہ نظر آتی ہوں اتنی ہی مُردہ ہوں اور اُس نے کہا تھا ، تمہیں پانا مشکل ہے تم نہایت پُراسرار ہو ۔ تمہارا اصل کیا ہے ؟ میں نے کہا وہ حصہ جو تمہیں اصل نظر آتا ہے ۔

تمہیں کب محسوس ہوا کہ وہ تم جیسی ہے ۔ ؟

جب ، جب اُس نے سگریٹ کا پیکٹ لیا تھا اور جب اُس نے کافی کا آرڈر دیا تھا اور . . . . . اور جب اُس نے سگریٹ بڑے اعتماد سے میری طرف بڑھایا تھا ، سُلگایا تھا ، پہلا کش لیا تھا اور جب وہ کھو گئی تھی ۔ جب وہ سمندر کی باتیں کر رہی تھی کہ سمندر کے پاس جا کر وہ خود کو بھول جاتی ہے یا سمندر کی پکار پہ وہ دیوانہ وار لہروں کی سمت بڑھتی ہے یا جب وہ عورت اور مرد کے رشتے کی گرہیں کھول رہی تھی ، جب وہ اپنے مرد کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کبھی کبھی نہیں رہتی ، سب کچھ سُنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سُنتی ، جب اُس نے کہا کہ وہ بے حس عورت ہے ۔

بے حس عورت ؟

ہاں جسے میں مُردہ کہتی ہوں، سرد کہتی ہوں جسے مرد کا لمس بھی بیدار نہیں کرتا جسے اپنے آپ میں رہتے ہوئے ایک عمر بیت گئی اور دوسروں میں اپنا چہرہ نمائش کرتی ہے جو سگریٹ پیتی ہے مگر مخصوص لوگوں کے سامنے جو اُس کے بارے میں کچھ ضرور جانتے ہیں۔ اور غلط رائے قائم نہیں کرتے جو اسے تبدیل نہیں کرتے۔ اُسے قبول کرتے ہیں اُسی صورت میں جسمیں وہ پہلے سے موجود ہے۔ جسطرح اُسکا شوہر ہے اُس نے اُسے تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس نے اُس کے سگریٹ پینے پہ اعتراض نہیں کیا جس نے اُسے چاہا ہے۔ اُسے اتنا پیار دیا ہے کہ کبھی وہ اُلجھنے لگتی ہے۔

کیا بہت زیادہ پیار سُکھ نہیں دیتا ؟

سُکھ دیتا ہے مگر دُکھ بھی دیتا ہے اور اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

کیا ؟

یہی کہ بے حس عورت کو زندہ کرنے میں وقت لگتا ہے اور شادی کے بعد عورت کو احساس ہوتا ہے۔ کہ اُس نے اپنے آپ کو کتنا کھو دیا ہے۔

کھو دیا ہے ؟

ہاں اپنے جائز حقوق اور جذبوں کو کھو دیا ہے پھر جب وہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنے مرد سے پیار کر رہی ہے دراصل اس وقت وہ خود سے بھی نہیں پیار کر رہی ہوتی۔ وہ اپنے اس جھوٹ بلکہ اپنے اس سچے جھوٹ پہ پریشان ہوتی ہے اور خود کو سزا دیتی ہے۔

کیا اُس کا جھوٹ پکڑا نہیں جاتا ؟

شائد نہیں۔

سزا کیا دیتی ہے ؟

خود سے چھپتی ہے۔ کمروں کے کونوں کھدروں میں آنسوؤں کے بیج بوتی ہے۔

آنسوؤں کے بیج ؟

ہاں ! آنسوؤں کے بیج

یہ بیج کیسی فصل دیتے ہیں ؟

اذیت اور دُکھ کی فصل جو کچھ انسانوں کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

سُنو ! تمہیں وہ لڑکی کیسی لگی ؟

ایک سطح پر اپنے جیسی ۔

تمہیں تو ہر عورت کسی نہ کسی سطح پر اپنے جیسی لگتی ہے ۔

ٹھیک کہتی ہو تم ۔

میں ہمیشہ ہی ٹھیک کہتی ہوں ۔

شائد ——— ۔

کچھ اور بتاؤ ؟

کیا بتاؤں ؟

یہی کہ اُس عورت نے تمہیں کیسے تلاش کیا ؟

کوشش کی اور سچ میں گڑپ کے رہ گئی ۔

کیوں ؟

اُس کی آنکھیں بہت سچی تھیں اور وہ میری آنکھوں میں نہیں میرے دل میں جھانک رہی تھی ۔

کیا دل میں جھانک رہی تھی ؟

ہاں اور اس کا شوہر اُسکا دوست وہ دونوں بھی اُس جیسے ہی تھے ۔

اُس جیسے ؟ مطلب تم جیسے ؟

ہاں ! کچھ کچھ مجھ جیسے اور تم جانتی ہو کہ وہ پاگل لڑکی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کونسی لڑکی ؟

کوئی بھی ہو تمہیں اس سے کیا ؟ بس ایک پاگل لڑکی نے کہا ہے کہ وہ اب پھر سے خود کو دریافت کرنے کی کوشش میں ہے ۔

پھر تم کیوں پریشان ہو ؟

اس لیے کہ اُس نے ابھی تک خود شناسی کا فن نہیں سیکھا اور وہ خود کو بلاوجہ لہولہان کرلے گی میں نے اُسے کہا ہے کہ وہ یہ ارادہ ترک کر دے کیونکہ ذات ، انسانی ذات تو ایک بہت گہرا کنواں ہے ، بہت بڑی دلدل ہے ، دھنستی چلی جائے گی اور خود کو مٹا ڈالے گی ۔

مگر تمہیں کیا ؟

ہاں مجھے کیا مگر وہ ایک کم علم عورت ہے وہ کچھ بھی نہیں جانتی کچھ بھی تو نہیں جانتی جانے گی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اندھی ہو جائے گی اندھی ؟ پاگل ہو جائے گی ، ڈھے جائے گی ، ابھی تو اُسے خود کو سمیٹنے کا سلیقہ بھی نہیں

ابھی تو اُس نے زندگی کو برتا بھی نہیں ابھی تو وہ بہت معصوم ہے ، مجروح ہو جائے گی مجھے دُکھ ہوگا۔

تم خواہ مخواہ دُکھی ہوتی ہو !

مجھے سُکھ راس ہی کب آتے ہیں۔

ارے یہ تم نے کیا کہہ دیا ؟ اتنی منفی سوچ اچھی نہیں مثبت سوچ اپناؤ ۔ مثبت سوچ ۔

ہاں مگر کیا کبھی تم نے یہ سوچا ہے کہ کسی کی سوچ منفی کیوں ہوتی ہے ۔

نہیں ۔

مثبت کیوں ہوتی ہے ؟

نہیں نہیں کبھی نہیں ، بھئی یہ سوچنا میرا کام نہیں یہ سوچنا تو شائد کسی کا بھی کام نہیں ۔

دیکھو ! جب کسی کا کام اور ہر کام غلط ہوتا رہا ہو ناں تب وہ منفی انداز سے سوچتا ہے اور جب کوئی پتھر کو ہاتھ لگائے وہ سونا بن جائے بنتا چلا جائے تو اس کی سوچ بھی مثبت ہو جاتی ہے اتنی سی بات ہے جو کوئی سوچنا سمجھنا نہیں چاہتا ۔

جب کوئی سوچنا سمجھنا نہیں چاہتا تو تم کیوں سمجھانے بیٹھ جاتی ہو ؟

بس یونہی ۔

کیا یہ تمہاری غلطی نہیں ہے کہ ہر ایک پر ہی اپنے خیالات ٹھونسنا اپنے فیصلے سُنانا ۔

نہیں نہیں مجھ پر یہ غلط الزام مت لگاؤ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا اور تم جانتی ہو میں ہمیشہ اپنی ہر غلطی مانتی آئی ہوں مگر جو غلطیاں میں نے کی ہی نہیں انہیں کس طرح تسلیم کروں ؟

جسطرح دوسرے لوگ اپنی غلطیاں تسلیم نہیں کرتے ۔ کبھی بھی نہیں کرتے ۔

ہاں کچھ لوگ کبھی کبھی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں جب مصلحت ہو اور کبھی کچھ بھی نہیں کرتے کہ وہ اس بات کو ضروری اور اہم نہیں سمجھتے ۔

مگر تم کون ہوتی ہو دوسروں کے بارے میں اسطرح باتیں کرنے والی جو شخص جسطرح اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے گزارے ۔

ہاں ضرور گزارے میں نے کب منع کیا ہے مگر دوسروں کو بھی یہی اجازت یہی حق یہی آزادی دی جائے ۔

پھر وہی بات !

ہاں ! ہاں میں کوئی بھی نہیں ہوتی اس لیے کہتی ہوں اگر اُن میں سے ہوتی تو کیوں کہتی ؟

اُن جیسی ہوتی تب ناں !

ہاں میں اُن جیسی نہیں ہوں ۔

کیا یہ اچھی بات نہیں ہے ؟

یہ اچھی اور بُری بات ہے کہ میں اُن جیسی نہیں ہوں ۔ اُن میں سے ہوتے ہوئے بھی اُن جیسی نہیں ہوں ۔

کیا تم شروع سے ایسی ہو ؟

شائد ۔

شائد ؟

ہاں ممکن ہے میں کہیں بعد میں ایسی بنی ہوں مگر جانتی ہوں کہ اُن جیسی نہیں ہوں ہو بھی نہیں سکتی ۔

کیوں ؟

بہت سی وجوہات ہیں ۔

کیا تم قربانی نہیں دے سکتی ہے

کیسی قربانی ؟

اُن کے مزاج میں رنگنے کی قربانی

نہیں ۔ دراصل میں نے اتنی قربانیاں دی ہیں کہ اب اور کی گنجائش نہیں ۔ اُن کے مزاج میں میں کبھی بھی نہیں رنگ سکتی ۔ میں بے رنگ ہوں یا میرا اپنا کوئی رنگ ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ بس میں اُس رنگ میں خود کو نہیں رنگ سکتی ، یہ میری مجبوری ہے ۔ وہ مجبور ہیں بھی اور نہیں بھی جسطرح وہ اپنا رنگ نہیں چھوڑنا چاہتے اسی طرح میں خود سے الگ نہیں ہونا چاہتی ۔

پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا ؟ کب ہوگا ؟ ہوگا بھی یا نہیں ؟
یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا ۔ کیسے ہوگا نہیں جانتی ؟
کیا تم اپنے مسائل کے بارے میں بھی نہیں جانتیں ؟

ہاں میں اپنے مسائل کے بارے میں بھی نہیں جانتی بلکہ ہم سب ہی نہیں جانتے ہم جاننے کی کوشش نہیں کرتے ، نہیں کرنا چاہتے ۔

کیا ہمارے مسائل وسیع اور گھمبیر ہیں ؟

ہیں بھی اور نہیں بھی ۔

تم پہلیاں ہی ڈالتی رہتی ہو ؟

ہم سب ڈالتے ہیں کچھ پہیلیاں بوجھ لیتے ہیں اور کچھ کے بارے میں ہم کبھی نہیں بتا سکتے ۔

تم بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ کچھ کا بچپن کبھی نہیں جاتا اور کچھ کا بچپن پلک جھپکنے میں گزر جاتا ہے۔ لڑکی تو بچپن گڑیا کی طرح اُسی وقت سہم کے ہاتھ سے پھینک دیتی ہے جب فراک کی جگہ اُسے شلوار قمیص دیا جاتا ہے اور ڈوپٹہ اوڑھنے کی ہدایت کی جاتی ہے جبکہ مرد کا بچپن کبھی نہیں جاتا ۔

کیا مرد کا بچپن کبھی نہیں جاتا ؟

تم ہٹرک پر آنکھیں کھول کر نہیں چلتیں ، تمہیں نہیں پتہ کہ دیواروں کے سائے میں جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھنے والے مردوں کا بچپن کبھی نہیں جاتا ۔ ہاں واقعی یہ سچ ہے کہ مرد کا بچپن کبھی نہیں جاتا تبھی وہ عورت میں ماں کی جھلک ، اُستانی کا غصہ دیکھنا چاہتا ہے ۔

کیا ہر عورت میں ؟

ہاں اُن عورتوں میں جو اُس کی زندگی میں آئیں ۔

کیا یہ بھی سچ ہے کہ مرد پہلی عورت کو کبھی نہیں بھولتا ۔

ہاں مرد کسی بھی عورت کو نہیں بھولتا ۔ استعمال ہونے والی اور نہ ہونے والی ہر عورت اس کے حافظے میں محفوظ رہتی ہے چند سیکنڈ کی ملاقات ہو یا برسوں کا ساتھ ہو ، چہرہ دیکھا ہو یا صرف آواز سنی ہو ۔ مرد کی یادداشت اچھی ہوتی ہے ۔

کیا عورت سے بھی زیادہ اچھی ؟

نہیں ہر عورت سے زیادہ اچھی نہیں مگر بیشتر عورتوں سے زیادہ اچھی ۔

تم ہمیشہ چند عورتوں پر آکر کیوں ٹھہر جاتی ہو ؟

سب ٹھہر جاتے ہیں ۔ پہلے مرد عام عورت کی تلاش میں رہتا تھا اب خاص عورت کے پیچھے بھاگتا ہے ، بھاگتا بھی چلا جاتا ہے ۔

تمہارے بیانات متضاد کیوں ہیں ؟

متضاد کیوں ہیں ؟ اس لئے کہ زندگی کا ہر لمحہ ہر دوسرے لمحے کی تردید کرتا ہے ، ہر نیا تجربہ گذشتہ تجربے کو جھٹلاتا ہے ۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے ؟

کیونکہ یہ زندگی ہے زندگی کی کوکھ سے نکلی ہوئی اولاد ہے اور ہر اولاد دوسرے سے کسی طرح مختلف ضرور ہوتی ہے ۔ ہر منزل کو ایک ہی راستہ نہیں جاتا ۔ کبھی سب راستے جاتے ہیں ۔ اور کبھی کوئی

راستہ بھی نہیں جاتا ۔

کیا ایسی منزلیں بھی ہیں ۔ جہاں کوئی راستہ نہیں جاتا ؟

ہاں ایسی بھی منزلیں ہوتی ہیں ۔ میں ایسی ہی منزل کے لیے مسافت طے کر رہی ہوں بے انت سفر انجانی منزل ۔

کیا کسی کو علم ہو تب بھی وہ ایسے راستے پہ چلتا رہتا ہے ؟

ہاں کوئی چلتا رہتا ہے ۔

کیا تم کوئی ہو ؟

ہاں میں کوئی بھی ہوں اور کوئی بھی نہیں ہوں ، کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں ہوں ۔ ہاں اور ناں کے بیچ ٹھہرا وہ لمحہ ہوں جو گذرنے میں نہیں آتا ۔ وقت ٹھہر گیا ہے ، وقت جانے کب سے ٹھہرا ہوا ہے ۔ ٹھہرا رہے گا ؟

کیا وقت ٹھہرا رہے گا ؟

ہاں چلتا رہے گا ٹھہرتا رہے گا کہ منزل کی خبر نہیں اور راستے اجنبی ہیں جسطرح انسان شناسا ہیں مگر اجنبی ہیں ۔ ایک دوسرے کو جانتے ہیں ۔ اور نہیں جانتے ، سمجھتے ہیں اور نہیں سمجھتے ہم ہاں اور ناں کے بیچ کیوں ٹھہر گئے ہیں ؟ کوئی نہیں جانتا ۔

کیا کوئی نہیں جانتا ؟

ہاں کوئی بھی نہیں جانتا اور سب جانتے ہیں ، سب جانتے ہیں مگر نہیں جانتے ، بالکل بھی نہیں جانتے ۔

جاننا نہیں چاہتے یا واقعی نہیں جانتے ؟

پتہ نہیں ، پتہ نہیں ، تم مجھ سے سوال مت کرو میں نہیں جانتی یا میں جانتی ہوں ان باتوں کی کوئی اہمیت اور ضرورت باقی نہیں رہتی ، باقی نہیں رہی ۔

کن باتوں کی اہمیت اور ضرورت باقی نہیں رہی ؟

سب باتوں کی ، کسی بھی بات کی ۔

تم کیا کہہ رہی ہو ؟

میں کچھ بھی نہیں کہہ رہی اور سبھی کہہ رہی ہوں مگر تم نہیں جانتیں کوئی نہیں جانتا بس میں جانتی ہوں ، میں جانتی ہوں اور شائد نہیں جانتی ، نہیں جانتی ؟ نہیں جانتی !

گیلی سڑک

تمہیں سڑکیں پسند ہیں ؟

ہاں سڑکیں بھی ؟

اور کیا کچھ پسند ہے ؟

راستوں کی تو ہر چیز ہی پیاری ہوتی ہے مثلاً راستوں کے راہی ، زمین کی مٹی ، بکھرے پتے ، کچھ زندہ کچھ مُردہ ، کچھ زندہ مُردہ ، کچھ سوکھے کچھ تازہ ، پتے ، درخت اور . . . . . .

تم خاموش کیوں ہو گئیں ؟

بس یونہی ۔

یونہی ؟

ہاں انہی راستوں پہ چلی گئی تھی جو صرف راستے ہیں ، صرف راستے !

تمہیں کونسا موسم اچھا لگتا ہے ؟

سبھی — کوئی بھی نہیں ۔

کیا مطلب ؟

مطلب یہ کہ گرمیوں کی شام جب موتیا کی مہکار ہر سمت پھیل ہو تب کتنا اچھا لگتا ہے اور

گرمیوں کی تپتی جھلستی دوپہریں ۔

اُس وقت تو سب لوگ گھروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔

ہاں سب لوگ تو آرام کر رہے ہوتے ہیں ۔ مگر چند لوگ نہیں ، تم بھول جاتی ہو کہ میں اُن چند لوگوں میں سے ایک ہوں ۔ سردیوں کی لمبی راتیں اور اُداس دِن جب ، جب میں اندر باہر سے کانپتی ہوں اور روتی ہوں یا پھر خزاں جب ہر شاخ برہنہ ہو جاتی ہے ۔

تمہیں برہنگی اچھی لگتی ہے ؟

ہاں بہت اچھی ۔

وجہ ؟

شاخ اور عورت دُونوں کا حُسن مجھے متاثر کرتا ہے ۔

کیسی عورت ؟

خوبصورت عورت ، ہر اعتبار سے مکمل ۔

اپنے جیسی ؟

ہاں ! شائد اپنے ہی جیسی ۔

تم حُسن پرست ہو اور بہار تمہارا پسندیدہ موسم نہیں ؟

نہیں ۔

کیوں ؟

بہار تو بہت کم عرصہ کے لیے آتی ہے ۔ مجھے مسکراہٹ پسند ہے وہ سچی ہوتی ہے ناں ۔

تمہیں برسات کیسی لگتی ہے ؟

برسات میرے اندر باہر ہوتی رہتی ہے اس لیے میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ۔ دلکشی نہیں ، تم نہیں جانتی ہو بارش تو میری وحشت میں اضافہ کرتی ہے جی چاہتا ہے کہ بارش میں بھیگتی رہوں اور پھر ——— پھر ؟ چھوڑو کوئی اور بات ۔

کیا تم اتنی کمزور ہو کہ بارش کے ذکر سے پریشان ہو جاتی ہو ؟

شائد ایسا ہی ہو ۔

تو کیا تمہیں سچ بولنے سے ڈر لگتا ہے ؟

نہیں ، دراصل میں کسی کو بھی دُکھ نہیں دینا چاہتی ۔

اور خود کو ؟

تم میری بات رہنے دو ۔

تمہاری ہی بات کیوں رہنے دوں ؟

میں اتنی اہم نہیں ہوں ۔

تم کیسے اہم نہیں ہو ؟

چلو تم یہ سمجھو کہ میں ان باتوں سے بہت آگے نکل آئی ہوں، بہت دُور جہاں اپنا دُکھ راستہ نہیں روکتا مگر دوسروں کے دُکھ پاؤں کے گرد دائرہ کھینچتے ہیں اور میں اسی دائرے میں ٹھہرنے پہ مجبور ہو جاتی ہوں ۔

یہ مجبوری کیا ہوتی ہے ؟

مجبوری بھی بس ہوتی ہے ۔ زنجیر جیسی ہوتی ہے ۔

کونسی زنجیر ——— ؟ زنجیرِ عدل ؟

نہیں ۔

اچھا میں سمجھ گئی اگر یہ مجبوریاں نہ ہوں تو انسان مکمل طور پہ آزاد ہو سکتا ہے ناں ۔ پتہ نہیں ، ہاں پتہ نہیں مگر تم بحث کیوں کرتی ہو ؟

اچھا ! اب بحث نہیں کرتی مگر یہ تو بتاؤ گی کہ تمہیں شہر کونسا پسند ہے ؟

شہر ، کوئی بھی شہر، گاؤں جیسا یا جنگل جیسا ہو ۔ جہاں بہت ہنگامہ نہ ہو ۔ جہاں ٹریفک کا شور نہ ہو ۔

تم خود تو اتنے شور میں زندگی گذار رہی ہو ۔

مجبوری ہے ناں ۔

مجبوری کیسی ؟

زندگی کی مجبوری ، کچھ مجبوریاں دکھائی اور بتائی نہیں جا سکتیں مگر وہ موجود ہوتی ہیں ، رہتی ہیں ۔

جنگل کو تم شہر نہیں سمجھتیں ؟

وہاں بھی تو درخت ، پتے بہت سی زندہ چیزیں ہیں ، زندہ وجود ہیں ۔ ہاں دراصل میں خود کو ان چیزوں کے بہت قریب محسوس کرتی ہوں ۔ ان سے مجھے خوف نہیں آتا ——— ان میں مجھے اپنا پن ملتا ہے اور وہ میری تمام باتیں سمجھتے ہیں ۔

کون ؟

وہ سب ، تم کہاں سمجھو گی ؟ اب تم خاموش ہو گئی ہو یا پھر میں بھی خاموش ہوں ۔

تمہارا کیا خیال ہے کہ سوال ختم ہو گئے ؟

نہیں میں جانتی ہوں سوال کبھی ختم نہیں ہوتے وہ عمروں سے زیادہ مدت تک زندہ رہتے ہیں انسانوں کے بعد بھی سانس لیتے ہیں ۔

اچھا ! تو کیا تمہیں اسلام آباد پسند ہے ۔ مگر تم وہاں زیادہ عرصہ تو رہتیں نہیں ۔ کیوں ؟

میں وہاں نہیں رہتی اور رہتی ہوں مگر میرا ذہن میرا دل میرا بدن میرے پاؤں انہی سڑکوں پہ گھومتے ہیں ۔ بہت دُور تک بہت دیر تک نہایت خاموشی سے میں سفر کرتی ہوں ۔

کیا تم آوارہ گرد ہو ؟

شائد ۔

تم نے آوارہ گردی کہاں سے سیکھی ؟

میں نے جو کچھ بھی سیکھا ہے خود سے سیکھا ہے میری ذات کے اندر ایک مکمل ادارہ ہے جہاں ہر فن سکھایا جاتا ہے ۔

کیا تمام فنون صرف تم سیکھتی ہو ؟ دوسروں کو نہیں سکھاتی ہو ؟

جب بھی ضرورت محسوس ہو دوسروں کو سکھاتی ہوں ۔

تم خود کو بہت اہمیت دیتی ہو ؟

ہاں اور دوسروں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتی ہوں ۔

حیرت کی بات ہے کہ تم ان سڑکوں پر گھومتی رہتی ہو پھر بھی تمہارا دم گھٹتا ہے ۔

بس انہی کی وجہ سے تو دم میں دم ہے ورنہ . . . . . ؟

تمہیں کیسی سڑکیں پسند ہیں ؟

مجھے گیلی سڑکیں پسند ہیں ؟

گیلی ، گیلی ہی سڑک کیوں ؟

میں بہت مشکل پسند اور اذیت پسند عورت ہوں ، سیدھے سادے آسان راستوں پر میرے پاؤں ہی نہیں چلتے ۔

کیا تم بہت سہمی سہمی رہتی ہو ؟

یہ سوال تم نے کیوں کیا ؟

اس لیے کہ گیلی سڑک پہ پاؤں آہستہ احتیاط سے دھرنا پڑتا ہے ۔

ہاں سہم کر بھی چلتی ہوں اور بے خوف و خطر بھی چلتی ہوں، یوں بھی سڑکوں پہ انسانی چہرے یا بدن نہیں بلکہ صرف اور صرف آوازیں زندہ رہتی ہیں یا پھر قدموں کے نشان

تم بے خوف و خطر چلتی ہو ؟

ہاں نتائج کی پرواہ کئے بغیر

کیسی ہو تم ؟

بس ایسی ہی ہوں ۔ ایسی ہی !

وہ تو خیر تم ہو ہی مگر تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے ، میں تمام عمر تمہارے ساتھ رہی ہوں اور نہیں جانتی کہ تم کیا ہو ؟ آخر تمہاری زندگی کیا ہے ؟

تمہارے تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ میں اور میری زندگی ایک گیلی سڑک ہے ۔

گیلی سڑک ؟

ہاں گیلی سڑک جہاں میں ننگے پاؤں برسوں سے چل رہی ہوں میرا سفر کبھی نہ ختم ہو گا ۔ جب تک موسم ہیں ، زندگی ہے ، روح ہے ، موت ہے تب تک گیلی سڑک بھی ہے ۔ گیلی سڑک ، گیلی سڑک ، گیلی سڑک ، گیلی سڑک !

آخری سانس

تم نے مجھ سے اتنے سوال کیے ہیں کہ میں اُن کا جواب دیتے دیتے تھک گئی ہوں۔ کیوں نہ آج میں تم سے سوال پوچھوں؟

سوال؟

ہاں تم نے اب عُمر کے اس حصّے میں مجھ سے سوال پوچھے ہیں۔ اب سے پہلے تم خاموش تھیں۔ تمہیں سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

پہلے میں تمہارے ساتھ رہتے ہوئے اردگرد کے ماحول کو بھی دیکھتی تھی اور تمہارے حالات، واقعات اور تجربات کو بھی دیکھتی تھی کسی تیسرے فرد کی طرح۔ یہ عادت بھی بلکہ یہ ہنر بھی دراصل میں نے تم سے سیکھا کہ خود کو اجنبی سمجھ کر کس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

پھر تم نے کیا جانا؟

یہی کہ انسان ناظر کی حیثیت سے بہت کچھ سوچتا ہے۔ اپنے بارے میں درست فیصلے کر سکتا ہے۔ اس منظر میں موجود ہونا اور نہ ہونا ایک دلچسپ بات ہے۔ حالات اور واقعات کو زیادہ گہرائی سے بہتر انداز سے دیکھا اور جانا جا سکتا ہے۔ میں نے تمہیں بہت پُراسرار پایا ہے۔

تم نے مجھے پہلی مرتبہ کب دیکھا تھا؟

جب تم نے پہلی مرتبہ آنکھ کھولی تھی ۔

تب تو شائد موت بھی میرے سرہانے کھڑی تھی ۔

پھر کیا وہ تمہیں چھوڑ کر کہیں دُور چلی گئی ۔

نہیں وہ آکسیجن کی طرح میرے اندر باہر پھیل گئی ۔ اُس نے میری بہن سے مصافحہ کیا اور کسی اور دُنیا میں چلی گئی جہاں کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ لوگ کیسی مسافت طے کرتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں ؟ وہاں اُن پر کیا گزرتی ہے ؟ میں بھی کہاں اُلجھ گئی تم میرے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ تم نے پہلی مرتبہ مجھے اُس وقت دیکھا جب میں نے آنکھ کھولی تھی ۔ کیا پھر تم ہمیشہ میرے ساتھ رہیں ؟

ہاں ! ہر جگہ ہر مقام پر میں نے تمہارا ہر روپ دیکھا ۔

کیا تم نے میرا ہر روپ دیکھا ؟

نہیں وہ تمام روپ جو تم نے مجھے دکھائے ۔ تم میری سوچ سے کہیں زیادہ غیر روائتی ثابت ہوئیں اور کہیں کہیں بے انتہا روائتی بھی ۔

تم میرے ساتھ رہتے ہوئے تھک گئی ہوگی ۔

نہیں ۔

حیرت ہے تم نے میرے ساتھ اتنے برس خاموشی سے گزار دیئے کوئی شکوہ شکایت کیے بغیر اور تم مجھ سے خفا بھی نہیں ہوئیں ۔

یہ تو خوشی کی بات ہے دُکھ کی بات ہے ۔

میری طرح تم بھی دوراہے پہ آکے ٹھہر جاتی ہو ۔

کیونکہ میں نے یہ جان لیا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ انسان کو ایک بہت بڑے دوراہے پہ لا کھڑا کرتا ہے ۔

ہاں ! اب تم چلی جاؤ بس تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ ۔

تم علم اور تجربہ رکھتے ہوئے بھی مجھے یہ مشورہ دے رہی ہو ؟

تم کب تک میرا ساتھ دو گی ؟

جب تک تم رہو گی ناں تب تک ۔

میرا فیصلہ ہے کہ تم مجھ سے جُدا ہو جاؤ ۔

یہ تمہارا فیصلہ ہے میرا فیصلہ تو تمہاری زندگی کے ہر لمحے تک تمہارے ساتھ رہنے کا ہے ۔

تم اپنا فیصلہ بدل بھی تو سکتی ہو ۔

اگر بدل سکتی تو اُس پہلے لمحے میں ہی بدل دیتی جب میں نے تمہارے ساتھ رہنے کا سوچا تھا ۔ اب میں پیچھے نہیں جا سکتی ۔ جانتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح ہر نئے مقام پر اپنی ساری کشتیاں جلا دیتی ہوں ۔ سارے دروازوں پہ قفل لگا دیتی ہوں اور چابی غائب کر دیتی ہوں ۔ اب میں اپنی باتوں پہ پشیمان بھی نہیں ہوتی کیونکہ میں جانتی ہوں جس وقت جو فیصلہ کیا گیا وہی اُس لمحے کا سب سے بڑا سچ تھا ۔

پھر ان باتوں پر پچھتاوا کیسا ؟

تم ہر بات میں میری نقل کرتی ہو ؟

ہر شخص کے نقشِ قدم پہ کون چلتا ہے ؟ ہر ایک کی تقلید کون کرتا ہے ؟ یہ تو کچھ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جن کا پیچھا کرنے کی خواہش جاگتی ہے ۔

تمہیں میرے رنگ میں رنگنا کیسا لگا ؟

بہت اچھا ۔ اگر میرا اپنا کوئی رنگ ہوتا تو بالکل تمہارے رنگ جیسا ہوتا ۔ تمہارے جیسا ہونا تو بہت بڑی بات ہے ۔ بہت اہم بات ہے ۔ تم اسے کبھی بھی عام نہ سمجھنا ۔

میں تو عام باتوں کو بھی خاص سمجھتی ہوں ، جانتی ہوں پھر خاص کو عام کیسے سمجھوں گی کیسے جانوں گی ۔ ویسے تم چاہو تو تم میرے بعد میرے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتی ، لکھ سکتی ہو ، مگر ہاں مصلحتاً بہت سی باتیں تو لکھی بھی نہیں جا سکتیں ۔

پھر کیسے لکھا جا سکتا ہے ؟ تم بے فکر رہو میں تمہارے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہوں گی کچھ نہ لکھوں گی اور پھر تم نہ رہو گی تو میں کہاں رہوں گی ۔ جب ہم دونوں ہی نہیں رہیں گے تو کون کہے گا ، کیا کہے گا ؟ کیوں کہے گا ؟

ہمارے علاوہ کسی اور کے پاس ہمارے متعلق کوئی معلومات نہیں ہم بھی غالباً قریب المرگ ہیں ہم نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے بہت دیر تک زندہ رہے ہیں ۔

اب مزید جی کر کیا کریں گے ۔ پتہ نہیں زندگی کیسے رہے گی ؟ موت کیسے جیئے گی ۔ انسان انسانوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے ؟ ہمارے بعد جانے کیا ہو گا ؟ ہم نہیں جانتے یا ہم بہت زیادہ جانتے ہیں ۔ بہت کچھ جانتے ہیں لگتا ہے اب ہم اور سانس اُدھار نہیں لے سکتے " میں اور تم " ہم دونوں تو زندگی کے پہلے بھی قرضدار ہیں اُدھار کیسے چکائیں گے ؟ کون چکائے گا ؟ کوئی اور بھی ہے ـــــ ؟ کیا کوئی اور بھی ہے ہمارے جیسا ؟ کوئی ہے بھی یا کوئی نہیں ۔ ؟ افسوس کوئی بھی نہیں !

ممکن ہے کوئی ہو ؟

ہاں ممکن ہے کوئی ہو ہم جیسا ۔

کیا واقعی یہ ممکن ہے ؟

ہاں یہ ممکن بھی ہو سکتا ہے ۔

اور نا ممکن بھی ۔

مجھے تو کچھ معلوم نہیں ۔

یا بہت زیادہ علم ہے ۔

معلوم نہیں

معلوم نہیں ؟

نئے لکھاری اور نیا ادب

افسانہ

طاہر اسلم گورا

سفر آخر سفر ہے

خشک سمندر کی تھکان

غافر شہزاد

تصویریں سانس لیتی ہیں

امجد طفیل

اینٹیک شاپ

نزہت گردیزی

تھکن

محمد عالم خان

غلام جسموں کا نوحہ

ناولٹ

عائشہ اسلم

گیلی سڑک

طنز و مزاح

اعجاز رضوی

کلوزاپ (خاکے)

راشد شیخ

پندار کا صنم کدہ

سفر نامہ

آفتاب اقبال

سیٹ بیلٹ (سفر نامہ امریکہ)

تحقیق

شیما مجید

باقیات میراجی

تنقید

امجد طفیل

قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا نفسیاتی مطالعہ

شاعری

اعجاز کنور راجہ

فتراک

عباس تابش

تمہید

آسمان

جاوید انور

شہر میں شام

شکیل اختر

ہوائے مہرباں

قمر رضا شہزاد

بنیاد